فروری ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ :

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ
ترجمان القرآن
لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل۔ ۵۳۴۰

جلد ۱۱۹ عدد ۲

فروری ۱۹۹۳ء شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ

فہرست مضامین

اشارات	خرم مراد	۳
حکمت مودودیؒ دعوت کے کام کے لیے جماعتی اوصاف		۱۴
فہم قرآن ـــــ تفاسیر کی روشنی میں	اخذ و ترتیب: خرم مراد	۱۹
قرآن کی بعض صفات (قسط ۱)	نعیم الدین اصلاحی	۳۲
مولانا سید احمد عروج قادری مرحوم (قسط ۱) ایک شناسا کے تاثرات	سید معین الدین احمد قادری	۳۸
رسائل و مسائل ثعلبہ بن حاطب انصاری کا واقعہ	ملک غلام علی	۴۸
مطبوعات پاکستان میں مسیحیت (دو حصے)، نصف صدی قبل کا سفرنامہ حج		۵۳

برائے ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ ۵۴۵۷۰ ــــ فون نمبر ۸-۴۱۲۴۰۷۰ فیکس (۰۴۲) ۴۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور: رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ ۵۴۰۰۰ فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵

پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ ۶ روپے ○ زرِ سالانہ: ۶۰ روپے (اندرونِ ملک)

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر 'ترجمان القرآن' اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

جماعت اسلامی کا مقصد، بحیثیت جماعت کے ' اس دنیا میں اقامتِ دین کی سعی ہے۔ ہر شخص جو جماعت میں شامل ہوتا ہے ' اس کا ذاتی مقصد دنیا میں اس سعی کے ذریعہ رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے۔ رضائے الٰہی کا حصول ہی اس کی اصل کامیابی ہے۔ اقامتِ دین کے معنی یہ ہیں کہ " پوری انسانی زندگی --- انفرادی اور اجتماعی --- میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے۔ " اس سعی میں ' جماعت " جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتی ہے وہ یہ ہے کہ فساق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامتِ صالحہ کا نظام قائم ہو۔ " ہم رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ امامتِ صالحہ کی اس منزل تک پہنچنے کی سعی وجہد ہی کو سمجھتے ہیں۔

یہ امامت پوری زندگی کی اور اس کے ہر شعبہ کی امامت و قیادت ہے۔ لیکن بانیِ جماعت مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں ' یہ بات کسی اشتباہ کے بغیر واضح ہے کہ حکومت کی " زمامِ کار کی تبدیلی کو ہمارے نظامِ فکر و عمل میں آغاز تحریک ہی سے بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں بلا خوفِ تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دراصل یہی وہ امتیازی وصف ہے جو زمانۂ قریب کی تاریخ میں ' کم از کم برعظیم ہند کی حد تک ' جماعتِ اسلامی کی تحریک کو دوسری تحریکوں سے ممیز کرتا ہے۔ "

اسی لیے پاکستان میں ہماری جدوجہد میں اس تصور کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کرنے کے لیے قیادت کی تبدیلی ناگزیر ہے۔

جماعت اپنے پیشِ نظر درج بالا اصلاح و انقلاب اور تبدیلی کے لیے ' اپنے دستور کی رو سے ' اس بات کی پابند ہے کہ وہ جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے۔ جماعت کا دستور ان

جمہوری اور آئینی طریقوں کا تعین نہیں کرتا ' اور بجا طور پر نہیں کرتا ' کیوں کہ حالات کے لحاظ سے ان طریقوں کی عملی صورتیں بدل سکتی ہیں۔ لیکن ۱۹۵۷ میں ماچھی گوٹھ میں جماعت کے ارکان کے اجتماعِ عام نے یہ طے کر دیا کہ ہم جس ملک میں کام کر رہے ہیں وہاں ایک آئینی وجمہوری نظام قائم ہے ' اور اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا ایک ہی آئینی راستہ ہے ' اور وہ ہے انتخابات کا راستہ۔ اس طرح انتخابات میں کامیابی ہمارے لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہو گئی ' کیونکہ اقامتِ دین کی سعی میں اپنی انتہائی منزل تک پہنچنے کا انحصار انتخابات میں کامیابی پر ٹھہرا۔

جب ہم نے حکومت کی زمامِ کار میں تبدیلی کے لیے انتخابات کی راہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ' تو ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہو گیا کہ ایک طرف اس راہ کو مسدود کرنے کی ہر کوشش کی بھرپور مزاحمت کریں ' اور دوسری طرف وہ تمام ممکنہ جائز تدابیر اختیار کریں جن سے انتخابات میں' اور اس طرح اپنے مقصد کے حصول میں' کامیابی ممکن ہو سکے۔

چنانچہ جب بھی انتخابات کی راہ مسدود کی گئی ' آئینی و جمہوری نظام کو ختم کیا گیا' بنیادی حقوق غصب کیے گئے ' بالغ رائے دہی کا حق سلب کیا گیا ' تو جماعت نے ان اقدامات کے خلاف ہر طرح کے حلیف کے ساتھ اتحاد کیا ' ان کے ساتھ متحد ہو کر بحالیٔ جمہوریت کی تحریک چلائی' اور جیسے کچھ بھی انتخابات ہوئے ان میں حصہ لیا۔ ۱۹۷۷ کے بعد سے جمہوریت اور انتخابات کے بارہ میں ہمارے ہاں کتنا ہی فکری الجھاؤ پیدا کیا گیا ہو ' اور پیدا ہو گیا ہو 'اور' اسلامی شورائیت بمقابلہ جمہوریت کی کتنی ہی مغالطہ آمیز فضا پیدا کر دی گئی ہو ' ان دونوں کے ہماری ترجیحات میں ہمیشہ سرفہرست رہنے کی دینی اور فکری بنیاد روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

اسی طرح 'انتخابات میں کامیابی ممکن بنانے' یا سیکولر اور مخالفِ جمہوریت واسلام عناصر کو ناکام کرنے ' کے لیے بھی ہم برابر مختلف تدابیر اختیار کرتے رہے۔ ان تدابیر کے ضمن میں ' سب سے بڑھ کر ہم ہمیشہ' صرف مقصد سے اتفاق کی بنیاد پر' بالکل مختلف اور متنوع عناصر کے ساتھ اتحاد قائم کر کے ان کی قوتوں کو مجتمع کرتے رہے ہیں۔

انتخابی عمل اپنی ماہیت کے لحاظ سے ایک اتحادی عمل ہوتا ہے۔ یعنی ہر طرح کے خیال اور کردار کے حامل انسانوں میں سے زیادہ سے زیادہ تعداد کو ' ایک حلقے یا پورے ملک میں ' اپنے پیچھے بیلٹ بکس میں متحد اور جمع کر لینے میں کامیابی ہی پر انتخاب میں کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ ایک انسانی معاشرہ کے تمام افراد اپنی سوچ اور کردار کے معیار کے لحاظ سے کبھی بھی یکساں ' ہم رنگ ' اور ایک طرح کے نہیں ہوئے ' نہ ہو سکتے ہیں۔ ان میں بے پناہ تنوع اور

فرق و اختلاف کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ انتخابی عمل کا انحصار انہی مختلف افراد اور عناصر پر ہوتا ہے' اور کامیابی کے لیے انہی کی ایک معتد بہ تعداد کی حمایت کو مجتمع کرلینا ضروری ہوتا ہے۔

یہ معاملہ صرف انتخابی عمل ہی کا نہیں' کسی بھی سماجی عمل کے لیے جو ایک انسانی معاشرہ میں انسانوں ہی کی قوت کے ذریعہ تغیر اور اصلاح و انقلاب کا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو' حتیٰ کہ جنگ اور جہاد جیسے عمل کے لیے بھی' یہ ناگزیر ہے کہ وہ کامیابی کے لیے ہر طرح کے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ قوت کو اپنے مقصد کے پیچھے متحد اور مجتمع کر لے۔ ہمارے اپنے ملک میں تحریکِ پاکستان سے لے کر پیپلز پارٹی اور اسلامی جمہوری اتحاد تک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جنگ کے میدان میں بھی ایسی ہی مثالیں موجود ہیں۔ جرمنی نے روس کے ساتھ اتحاد کیا' پھر روس اور امریکہ اور برطانیہ کو اتحاد کرنا پڑا' اور حال ہی میں جنگِ خلیج کے موقع پر بالکل مختلف اور متضاد بلکہ معاند قوتوں کو بھی متحد اور مجتمع کیا گیا حالانکہ عسکری قوت کے لحاظ سے یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ تشریف لاتے ہی یہودیوں تک کو ایک ملتِ واحدہ میں' اپنی قیادت میں' متحد فرمایا' اور پھر زیادہ سے زیادہ کافر اور مشرک قبائل سے جس نوعیت کا ممکن ہوا اس نوعیت کا حلیفانہ معاہدہ کیا۔

اس قسم کے ہر عمل میں اپنے مقصد کا پورا فہم رکھنے والے اور اس کے لیے یکسو' اور اس کے معیار پر پورا اترنے والے' تربیت یافتہ افراد کا ایک نیوکلیئس ضروری ہے' اور یہ نیوکلیئس ہی قیادت فراہم کرتا ہے' لیکن معرکے جیت لینے کے لیے اس کو اپنے گرد ایک بہت وسیع ہالہ بنانا ناگزیر ہے 'جو لازماً" خیال اور عمل کے لحاظ سے متنوع اور مختلف افراد پر مشتمل ہوگا۔

لہٰذا' ہر سیاسی و سماجی عمل کی طرح' انتخابی عمل میں بھی کامیابی کا امکان پیدا کرنے کے لیے مختلف النوع عناصر کو اپنے مقصد کے پیچھے جمع کر لینے کی کوئی نہ کوئی تدبیر اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ اس حقیقت کا ادراک ہی تھا کہ بانی جماعت" نے ۱۹۵۶ کے دستور کے تحت ہی متوقع انتخابات کے لیے نظامِ اسلام پارٹی بنوائی بھی' اور اس کے ساتھ انتخابی معاہدہ بھی کیا۔ اس کے ساتھ ہی' انہوں نے مسلم لیگ کے ساتھ بھی اسی قسم کے معاہدہ کے لیے بات چیت شروع کر دی تھی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ۱۹۵۱ میں پنجاب میں انتخابات میں پہلی شرکت کے لیے پارٹی ٹکٹ کے بجائے پنچایتی نظام کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا' جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک وسیع تر بنیاد پر مختلف النوع افراد کے اتحاد ہی کی ایک صورت تھی۔

اسی طرح جب ایوب خاں نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست انتخابات کی راہ مسدود

کر دی ' تو یہ راہ کھولنے کے لیے انہوں نے سہروردی ' بھاشانی اور مجیب الرحمٰن جیسے عناصر تک کے ساتھ اتحاد بنایا ' اور اس مقصد کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت سے بھی گریز نہ کیا۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات کے لیے ایک نام سے کوئی اتحاد تو نہ بنا ' لیکن مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر حلقہ میں واحد امیدوار کھڑا کرنے کی خاطر مختلف جماعتوں کے ساتھ ممکنہ مفاہمتیں کی گئیں۔

انتخابی عمل کے تقاضوں کے اسی ادراک کا نتیجہ تھا ' اور اسی پالیسی کا تسلسل ' کہ ۱۹۷۰ کے بعد سے آج تک جماعت نے ہر انتخاب میں کسی نہ کسی اتحاد کی صورت ہی میں حصہ لیا ہے۔ نہ نام جماعت کا تھا ' نہ نشان اپنا تھا ' نہ منشور۔ ۱۹۸۵ کے غیر جماعتی انتخابات میں تو اس کے علاوہ کوئی چارا نہ تھا ' ۱۹۷۷ میں بھی وہ پاکستان قومی اتحاد کے پرچم تلے تھی جہاں اصغر خاں اور بیگم نسیم ولی خان جیسے لوگ بھی موجود تھے ' اور ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ میں وہ اسلامی جمہوری اتحاد کا حصہ تھی۔ ان تمام انتخابات میں نہ صرف جماعت ' انتخابات کی حد تک ' ایک دوسری اتحادی تنظیمی ہیئت میں ضم ہو گئی تھی ' بلکہ اس اتحاد میں اس کی آواز فیصلہ کن بھی نہ تھی۔

پھر یہی وجہ تھی کہ قرار دادِ ماچھی گوٹھ (۱۹۵۷) میں جب انتخابات میں حصہ لینے کا طریقِ کار اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا ' تو اس میں " بالواسطہ " حصہ لینے کی گنجائش خاص طور پر رکھی گئی ' اور امیرِ جماعت" کی اس ہدایت کے ساتھ رکھی گئی کہ " وسیع پالیسی بنا کر مجلسِ شوریٰ کو دے دیجیے ' تفصیلات طے کر کے اپنے ہاتھ باندھ نہ لیجیے "۔ " بالواسطہ " حصہ لینے کا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ براہِ راست جماعتِ اسلامی کے نام سے انتخاب لڑنے کے بجائے ایسے عناصر کو کامیاب کرانے کی کوشش کرنا جو " اسلامی نظام کے قیام کے مقصد میں ہم سے متفق ہوں ' اور جن سے ہم یہ امید رکھتے ہوں کہ وہ اس کے قیام کی کوشش میں مددگار بن سکیں گے۔ "

" بالواسطہ " حصہ لینے کی گنجائش رکھنے کا فیصلہ کتنا حکیمانہ تھا ' اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۷۰ کے بعد سے جماعت نے جب بھی انتخاب میں حصہ لیا تو کلیتاً " بالواسطہ " ہی لیا۔ اس لیے کہ اتحاد میں شامل ہو کر حصہ لینا " بالواسطہ " حصہ لینا ہی ہے ' جس میں ہم نے نہ صرف اتحاد کے ہر قسم کے نمائندوں کی حمایت کی ' بلکہ اپنے براہِ راست نمائندوں کو بھی اتحاد کے واسطہ سے کھڑا کیا۔

درج بالا تجزیہ اور تاریخی پس منظر میں ' اور آج کے حالات میں جب کہ ہم طرح طرح کے

اتحادوں کا ' اور آخر میں اسلامی جمہوری اتحاد کا ' تجربہ کر چکے ہیں ' اس مسئلہ پر گہرے غوروخوض کی ضرورت ہے کہ اندریں حالات ہمارے لیے انتخابات کے ذریعہ اپنے مقصد کا حصول ممکن بنانے کے لیے بہترین تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ ایسی تدبیر جو انتخابی عمل کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہو ' جو قرار دادِ ماچھی گوٹھ کے فریم ورک کے اندر بھی ہو ' جو ماضی کی پالیسی سے مختلف و متضاد بھی نہ ہو بلکہ جہاں تک ممکن ہو اس کے تسلسل میں ہو ' جو قابلِ عمل بھی ہو ' اور جو نتیجہ خیز ہونے کا امکان بھی رکھتی ہو۔

غور کیا جائے تو ہمارے سامنے ' جوہری طور پر ' دو ہی راستے ہیں ' اگرچہ ان دونوں راستوں کی عملی شکلیں اپنی تفصیلات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جماعت براہِ راست اور تن تنہا انتخاب میں حصہ لے ' دوسرے یہ کہ کسی وسیع تر تنظیم کے ذریعہ لے۔ صرف براہِ راست اور تن تنہا حصہ لینا ' جیسا ہم نے تجزیہ کیا ہے ' انتخابی عمل کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں جب بھی انتخابات کا وقت آیا تو ملک کے حالات کی وجہ سے ہم نے جماعتوں کے وسیع تر اتحاد میں شامل ہو کر حصہ لینے کی پالیسی ہی اختیار کی۔ آج اگر ہم صرف براہِ راست حصہ لینے کے راستہ کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر بھی لیں ' تو کل عین انتخابات کے وقت غالباً ہم ماضی سے مختلف پالیسی اختیار نہیں کر سکیں گے۔

جہاں تک جماعتوں کے ساتھ اتحاد کا تعلق ہے ' تو ماضی کے تجربات ' اور حال ہی میں اسلامی جمہوری اتحاد میں شرکت اور اس سے علیحدگی کے تجربہ ' کے بعد اس راستہ کو قبول کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ ' ہم جو راستہ بھی اختیار کریں ' کسی بھی انتخاب کے وقت ' ملک کے حالات اور ضرورت کے لحاظ سے ' ایک یا ایک سے زائد جماعتوں کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت یا معاہدہ کا دروازہ ابھی سے بند کر لینا کوئی دانشمندی نہ ہو گی۔

صرف براہِ راست حصہ لینے کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جماعت اپنی موجودہ تنظیم کو' انتخابی عمل کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ' اتنا وسیع کر دے کہ اس میں مختلف خیال کے اور مختلف معیار کے وہ تمام عناصر شریک ہو سکیں جو اسلامی نظام کے قیام اور اس مقصد کے لیے زمامِ کار تبدیل کرنے کے مقصد کی حد تک ہم سے متفق ہوں۔ یہ راستہ اختیار کرنے کی صورت میں ' ایک طرف قابلِ اعتماد اور تربیت یافتہ افراد کا وہ نیوکلیئس ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے جو جماعت نے نصف صدی کی محنت سے جمع کیا ہے ' اور اس طرح عوام الناس کی صحیح رہنمائی ' مختلف عناصر کو صحیح راہ پر رکھنے ' اور اپنی اصل منزل تک پہنچنے کے امکانات بھی

مخدوش ہو سکتے ہیں۔ دوسری طرف جماعت کے لیے ایسے مختلف عناصر کو اپنے اندر سمونا اور سمیٹ کر رکھنا بھی مشکل ہو سکتا ہے۔

براہِ راست اور تن تنہا حصہ لینے کی ایک اور شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم کسی قرینِ قیاس مدت میں انتخابات کے ذریعہ زمامِ کار کی تبدیلی میں کامیابی پر بالکل نظر نہ رکھیں ' صرف ان چند نشستوں پر حصہ لیں جہاں ہماری کامیابی کا امکان ہو ' اور فی الجملہ یہ شرکت صرف دعوت کی غرض سے اور ایک پریشر گروپ کی حد تک کامیابی کے ہدف کے لیے ہو۔ انتخابات کا مقصد تو ملک کی زمامِ کار سنبھالنا ہوتا ہے ' اور اس کی حیثیت ایک "پرامن" سیاسی جنگ کی ہے۔ اسی لیے ہم انتخابات میں شرکت کو ایک قسم کا جہاد سمجھتے بھی رہے ہیں ' اور کہتے بھی رہے ہیں۔ اس قسم کا ہر معرکہ جیتنے کے لیے ہی لڑا جاتا ہے ' نہ کہ محض دعوت و تبلیغ کے لیے۔ ایسے معرکہ میں فتح اور کامیابی ہی اصل دعوت ہے ' جس کے بعد يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کا منظر سامنے آ جاتا ہے ' اور شکست سے بڑھ کر دعوت کے منافی کوئی شے نہیں۔ انتخابات میں جو لوگ اپنے بارہ میں یہ تاثر دیں کہ زمامِ کار سنبھالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ' ان کے محدود اثرات بالآخر سکڑتے ہی جائیں گے۔ مزید برآں محدود شرکت سے وسیع ملک گیر دعوت کا مقصد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر ' انتخابات میں شرکت کو موثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے ' مختلف خیال اور معیار کے لوگوں کو متحد کرنے کی وہ تدبیر کیا ہو سکتی ہے جو جماعت کے اصولوں اور مستقل پالیسی کے فریم ورک میں بھی ہو ' اور جس کے نتیجہ خیز ہونے کا امکان بھی ہو ؟ مختلف تدابیر سوچی جا سکتی ہیں ' اور تمام متبادل تدابیر پر غور کرنا چاہیے ' لیکن ایک راستہ جس پر ضرور غور کرنا چاہیے یہ ہے کہ جماعت خود آگے بڑھ کے ایسے تمام عناصر کو ایک وسیع سیاسی محاذ بنانے کی دعوت دے ' اور عملاً اس کی تشکیل بھی کرے۔ اس محاذ میں وہ تمام محبِ اسلام ' محبِ وطن ' اور فرض شناس و دیانت دار افراد شامل ہو سکیں جو نظامِ اسلامی کے قیام کے مقصد میں ہم سے متفق ہوں ' ملک میں اب تک کی مختلف حکمران قیادتوں کی حقیقت کو سمجھ چکے ہوں ' ملک کی زمامِ کار سنبھالنے کے لیے ایک نئی قیادت بروئے کار لانا چاہتے ہوں ' اور اس مقصد کے لیے اپنا وزن ' قوت ' اور وسائل لگانے کے لیے تیار ہوں۔

ایسا وسیع سیاسی محاذ عین جماعت کے اصولوں اور پالیسی کے مطابق ہو گا' کیونکہ یہ قراردادِ ماچھی گوٹھ میں طے کردہ "بلاواسطہ" حصہ لینے کی ایک عملی تدبیر اور شکل ہی ہوگی۔ اور عین وہی

مصلحتیں پوری کرے گا جو اس وقت پیشِ نظر تھیں۔ ان کو پھر ایک دفعہ ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ صرف متفق عناصر کو، جن کو براہِ راست جماعت نہ کھڑا کرے، کامیاب کرانے کی کوشش میں اپنی قوتیں لگانا ایک "دشوار گزار گھاٹی" ضرور ہے، لیکن اس گھاٹی کو طے کرنا اس لیے ضروری ہے کہ

(۱) ہمارے پاس اتنے ذرائع (یعنی موزوں افراد اور وسائل) نہیں ہیں کہ پورے ملک میں سیکڑوں نشستوں پر بیک وقت مقابلہ میں براہِ راست بلاواسطہ حصہ لے سکیں۔

(۲) اتنے مصارف بھی ہمارے بس میں نہیں ہیں۔

(۳) ہمارے اثرات ملک میں یکساں نہیں، اور جہاں ہم خود نہ جیت سکتے ہوں وہاں اپنی طاقت کسی اچھے اور مفید آدمی کو کامیاب کرانے یا کسی برے آدمی کو روکنے، کے لیے لگانے کے بجائے اسے معطل رکھنا اور کسی مصرف میں نہ لانا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

(۴) جماعتِ اسلامی سے باہر جو گروہ اور افراد لادینی کے مخالف اور دینی نظام کے حامی ہیں ان کی قوتیں ایک دوسرے کی مزاحمت میں صرف ہو کر مخالفِ دین عناصر کی مددگار نہ بنیں، بلکہ ان کے درمیان تعاون ہو۔

(۵) پارلیمنٹ کے اندر بھی ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی آئے جو ہمارا ساتھ دینے والے ہوں۔

ان مصالح کے پیشِ نظر ہمارا فیصلہ یہ تھا کہ جہاں ہم براہِ راست حصہ نہیں لے رہے وہاں ہماری طاقت بے کار ضائع ہونے کے بجائے کسی حامی دین گروہ یا فرد کے حق میں استعمال ہو۔ بلکہ ہم اس حد تک بھی آگے بڑھنے کو تیار تھے کہ کسی نیک اور موزوں آدمی کو خود اٹھنے کا مشورہ دیں، اور اپنی تائید سے اسے کامیاب کرانے کی کوشش کریں، بشرطیکہ اسکے اپنے اثرات بھی اس کے حلقہ میں کافی ہوں، اور اس کی انتخابی جدوجہد کا سارا بار ہم پر نہ پڑے۔

اب بھلا اگر ایسے موزوں افراد کو اٹھنے کا مشورہ دینے، اور پھر ان کو کامیاب کرانے کی کوشش کرنے کے بجائے ہم انہیں ایسے محاذ میں شامل کر سکیں جس کو ہم خود تشکیل دیں، پارلیمنٹ کے اندر بھی وہ اس محاذ کے ڈسپلن کے پابند ہوں تو اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ایسے سیاسی محاذ کے تحت انتخابات میں حصہ لینے کی صورت میں جماعت کا نام

اور نشان انتخابات میں موجود نہ ہوں گے۔ لیکن جیسا ہم سب جانتے ہیں ۱۹۷۰ کے بعد سے جماعت نے ہر انتخاب میں اسی طرح حصہ لیا ہے اور یہ کوئی مختلف یا نئی صورت نہ ہو گی ' بلکہ اب تک کی پالیسی کا تسلسل ہی ہو گی۔ بلکہ ایسا محاذ ' سابقہ اتحادوں کے مقابلہ میں ' جماعت کے مقاصد کے لحاظ سے ' ایک بدرجہا بہتر صورت ہو گی۔ سابقہ سارے اتحاد بنیادی طور پر منفی مقاصد کے لیے ' یعنی برے آدمیوں کو روکنے کے لیے قائم کیے گئے تھے ' جب کہ ایسا محاذ مثبت طور پر اسلامی نظام کے قیام کے لیے ہوگا۔ سابقہ اتحادوں میں سیکولر اور مخالفِ اسلام جماعتیں بھی موجود تھیں ' جب کہ ایسے محاذ میں ایسا کوئی منظم گروہ نہ ہوگا ' اکا دکا افراد ایسے ضرور آ سکتے ہیں مگر بالعموم اسلام دوست افراد ہی ہوں گے۔ سابقہ اتحادوں میں جماعت کئی جماعتوں میں ایک ہوتی تھی ' اور کم و بیش اسی کے بقدر قیادت میں اس کا وزن ہوتا تھا ' جب کہ اس محاذ کی رہنمائی و قیادت میں جماعت کا وزن فیصلہ کن ہوگا۔ بنیادی طور پر اس وجہ سے کہ جب جماعت خود آگے بڑھ کر اس کی تشکیل کرے گی تو اس کو یہ مقام حاصل ہونا بالکل فطری ہو گا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے جو افراد محاذ میں آئیں گے جن کے اپنے اثرات بھی انکے حلقے میں کافی ہوں ' ان میں سے بعض اپنی ذاتی اغراض کی خاطر بھی آئیں گے۔ ان کے آنے سے معیار بھی گر جائے گا ' اور پھر محاذ اور مسلم لیگ جیسی دوسری جماعتوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ بات یہ ہے کہ ہر کامیابی کے لیے معرکہ کی مناسبت سے قوت ضروری ہوتی ہے۔ جب ہم نے انتخابات کا طریقہ اختیار کر لیا تو وہی قوت درکار ہے جس سے اس میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ قوت افرادی قوت اور عوامی حمایت و تعداد کی قوت ہے۔ اس قوت کو بحدِ استطاعت فراہم کرنے کی کوشش کرنا وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ کے تحت ضروری ہے۔ اس قوت کی فراہمی کے لیے توسیع ناگزیر ہے۔ توسیع کی رفتار تیز ہو گی ' تو استحکام میں کمی آنا اور مجموعی معیار میں کمی آنا بھی ایک فطری بات ہے۔ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جب نبی کریمؐ کے ساتھ لوگ فوج در فوج آئے تھے ' تو " ایک بڑی کثیر تعداد ان میں ایسی تھی جو دین کو پوری طرح سمجھ کر نہیں آئی تھی اور نہ دینی اخلاق کو اپنے اندر جذب کر سکی تھی۔ دین کی روح ان کے اندر اچھی طرح پیدا نہ ہو سکی تھی۔ " مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں " توسیع کتنی بھی ہوتی چلی جائے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ توسیع کو روکنے کی بھی ضرورت نہیں۔ توسیع ہونے دیجیے ' لیکن نیوکلیئس مضبوط بناتے جایئے۔ "

کثرتِ تعداد کی خواہش فی نفسہٖ مذموم نہیں ہے۔ یہ خواہش تو دعوت الی اللہ کی روح اور

مزاج کا تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچے ' وہ اس کو قبول کریں ' اور اس کی نصرت کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو یہ آرزو اس درجہ میں رکھتے تھے اور اس کے لیے اس قدر کوشاں رہتے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی محبت کے ساتھ آپ کو بار بار سمجھایا کہ "سب" ماننے والے نہیں ہیں اور "سب" کے پیچھے آپ خود کو ہلاک نہ کریں۔

جہاد کے لیے جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں اور گھروں سے نکل کر آتے ہیں ان میں بعض فسق وفجور کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں ' بعض کی نگاہیں رضائے الٰہی کے بجائے صرف مالِ غنیمت پر ہو سکتی ہیں ' بعض حمیت و عصبیت کی خاطر بھی آسکتے ہیں ' اور بعض دادِ شجاعت اور ناموری کے لیے بھی لڑ سکتے ہیں۔ لیکن جب تک جہاد ' جہاد فی سبیل اللہ ہے ' اور ان کی قوتیں ایسے جہاد کی تقویت اور کامیابی کے لیے لگ رہی ہیں ' انہیں پہلے بھی جہاد میں شریک کیا جاتا رہا ہے ' اور آج بھی کیا جانا چاہیے۔

جہاں تک کسی دوسری جماعت کے مماثل بن جانے کا خدشہ ہے ' تو یہ ایک مغالطہ آمیز دلیل ہے۔ میدانِ جنگ میں ' اپنی وضع قطع میں ' تنظیم و تربیت میں ' اسلحہ کی نوعیت اور جنگ کے فنی طریقوں میں ' خون ریزی کرنے میں ' مومنین اور کافرین کے لشکروں میں بظاہر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایک ظاہر بیں آدمی کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کیا فرق رہ گیا ہے ؟ لیکن حقیقت بین جانتا ہے کہ تمام ظاہری مماثلت کے باوجود دونوں بالکل مختلف ہیں۔ ایک کا مقصد اعلائے کلمتہ اللہ ہے اور اس کی جنگ ' احکامِ الٰہی اور اخلاقی حدود کی پابند ہے ' جب کہ دوسرے کا مقصد بالکل باطل ہے اور وہ احکامِ الٰہی اور اخلاقی حدود کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہماری تدابیر دوسروں کی تدابیر کی طرح ہیں ' اصل سوال یہ ہونا چاہیے کہ ہماری کون سی تدبیر اپنی روح یا ظاہر کے لحاظ سے اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف ہے ' یا ان کی عائد کردہ اخلاقی حدود سے متجاوز ہے۔ اور اس معاملہ میں یہ بنیادی اصول ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے کہ حکمِ الٰہی کی نافرمانی کر کے رضائے الٰہی کا حصول کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

بعض لوگوں کے نزدیک اقامتِ دین کی سعی کرتے ہوئے دنیا میں کامیابی کا محبوب و مطلوب ہونا ' کامیابی کے لیے نئی نئی تدابیر سوچنا اور انکو اختیار کرنا ' پسندیدہ اور مناسب نہیں ہے۔ حالانکہ آخرت میں رضائے الٰہی کے نصب العین ہونے اور دنیا میں نصرت و فتح کے محبوب و مطلوب ہونے میں ' ایک فرد کے لیے بھی ' کوئی تضاد اور تناقض نہیں۔ اور جماعت تو بنتی ہی ہے دنیا میں کامیابی کے حصول کے لیے۔ اللہ تعالیٰ جنت کو مقصودِ حقیقی بنانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ '

نصرت و فتح کے محبوب ہونے کی تحسین فرماتا ہے اور اس کی بشارت بھی دیتا ہے۔ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۚ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ (الصف)۔ رضائے الٰہی کے مژدہ کے ساتھ ساتھ فتح کا مژدہ بھی سناتا ہے' اور مال غنیمت کا وعدہ بھی فرماتا ہے۔ " وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا " اور " وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ " (الفتح)۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ صرف محاذ بنا لینے ہی سے' یا مختلف خیال و معیار کے افراد کی ایک معتدبہ تعداد کو مجتمع اور متحد کرنے کی کوئی اور تدبیر اختیار کر لینے ہی سے' کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح تو صرف ایک راستہ کھل جائے گا' اور چند موانعات دور ہو جائیں گے۔ لیکن راستہ چلنے ہی سے منزل ہاتھ آئے گی۔ اس کے لیے رویوں میں تبدیلی' حسنِ اخلاق' وسعتِ ظرف و نظر' آرزو اور جستجو' تدبرو حکمت' اخوت و محبت' بالغ نظر قیادت اور انتھک محنت کی ضرورت بھی ہوگی۔ اور سب سے بڑھ کر اعتصام باللہ کی' حنیفیت و للٰہیت کی' اور ذکرو اطاعتِ الٰہی کی۔ اس سارے زادِ راہ سے ہر لحہ اور ہرگام آگاہ رہنے اور اس کو فراہم کرنے کی کوشش میں لگے رہنے ہی سے یہ امکان پیدا ہوگا' ہم جو حکمتِ عملی اختیار کریں گے وہ کامیابی سے ہم کنار ہو گی۔

لیکن آج کا چیلنج یہی ہے۔ جماعتِ اسلامی نے نصف صدی کی محنت سے صرف قابلِ اعتماد انسانوں کا ایک مختصر گروہ ہی نہیں بنایا ہے' اس نے انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بھی متاثر کیا ہے اور اپنا ہم نوا بنایا ہے۔ یہ انسانوں کا بہت بڑا ذخیرہ فی الحال دنیا میں ہماری انتہائی منزل تک پہنچنے میں اپنا حصہ ادا نہیں کر رہا۔ ان میں سے ہر فرد بے پناہ صلاحیتوں کا حامل ہے۔اسی طرح ہمارے معاشرہ میں' اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود' صالحیت چھوٹی بڑی مقدار میں وسیع پیمانہ پر پائی جاتی ہے' جو صالح نظام اور امامتِ صالحہ بروئے کار لانے کے بالکل کام نہیں آ رہی۔ اپنے اندر سے اور اپنے باہر سے صلاحیت اور صالحیت کی ہر رمق کو جمع کر کے مطلوبہ تغیر اور انقلاب واصلاح کی جدوجہد میں لگا دینے کی حکمتِ عملی ہی پر ہماری کامیابی کا انحصار ہے۔

پاکستان اپنی زندگی کے انتہائی سنگین مسائل کا سامنا کرتے ہوئے قیادت کے بحران سے دوچار ہے' اس کا حل اگر کوئی ہو سکتا ہے تو ایسی کسی حکمتِ عملی ہی میں ہو سکتا ہے۔ آج اور ماضی قریب میں حکومت کے منصب پر فائز قیادتوں نے بدترین نااہلی' بدعنوانی' لوٹ کھسوٹ اور بد انتظامی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ملک میں دینی' اخلاقی' سیاسی اور معاشی طور پر ایک فسادِ عظیم برپا ہے۔

بدامنی اور خون ریزی ہر طرف عام ہے۔ انسانی شرف و وقار ' اور خصوصاً" عورت کی عزت ' کو بری طرح پامال کیا جا رہا ہے۔ جرائم ' اور سنگین سے سنگین تر جرائم ' اتنے عام ہو گئے ہیں ' اور ان کی شرح اتنی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے ' کہ ہر شہری خوف زدہ ہے۔ کشمیر جل رہا ہے۔ امریکہ پاکستان کو دہشت گرد قرار دینے اور ہر طرح مفلوج و ضعیف بنانے پر تلا ہوا ہے۔ فلسطین ' بوسنیا ' ہندوستانی مسلمان اور بابری مسجد ' جنگِ خلیج --- یہ سب علامات ہیں اس ذلت و مسکنت کی جو پوری ملتِ اسلامیہ کو درپیش ہے۔ لوگ مایوس ' مضطرب اور حیران کھڑے ہوئے ہیں۔ اس بحران سے نکلنے کا راستہ بتانا ' جماعتِ اسلامی کا فرض ہے۔

دوسری طرف تاریخ ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ دنیا کا ذرہ ذرہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ " فردا اسلام کا ہے "۔ الجیریا سے لے کر جکارتا تک ' خود امریکہ اور یورپ میں ' ملتِ اسلامیہ میں بیداری کی لہر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ مستقبل اپنے دامن میں امکانیات کے بھرپور خزانے لیے ہمارا منتظر ہے۔

کل کی طرح آج پھر اصل سوال یہ ہے کہ " آیا ہم جماعتی حیثیت سے اس وقت حالات کے اس چیلنج کا جواب دینے کے قابل ہیں یا نہیں "۔ وقت جب یہ سوال سامنے لاتا ہے تو صورتِ حال یہی ہوتی ہے کہ " ہر موقع ہاتھ سے جانے کے لیے اور ہر امکان ختم ہونے کے لیے اور ہر خطرہ واقع ہو جانے کے لیے پر تولے کھڑا ہوتا ہے "۔ کیا یہ ہمارے مقصد کے لیے مفید ہوگا کہ ہم آنکھیں بند کر کے اپنی راہ چلتے رہیں ' اور " تمام مواقع کھو دیں ' سارے امکانات ضائع کر دیں ' ہر ممکن خطرے کو نازل ہونے دیں ؟ " یہ اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ فردا کو اسلام کا بننے سے روکنے کا ابلیسی حربہ یہی ہوا کرتا ہے کہ

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

دعوت کے کام کے لیے جماعتی اوصاف

جماعتی حیثیت سے کچھ اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے۔ جماعتی نظم کو مستحکم اور کارگر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ارکانِ جماعت کے درمیان محبت و ہمدردی ہو' آپس میں حسنِ ظن ہو' بے اعتمادی کی جگہ اعتماد ہو' آپس میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہو' ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کی عادت ہو' خود آگے بڑھیں اور دوسروں کو اپنے ساتھ آگے بڑھائیں۔ یہ اوصاف ہر جماعتی نظم کے لیے ناگزیر ہیں ورنہ اگر فرداً" فرداً" سب لوگ اعلیٰ درجہ کی صفاتِ حسنہ اپنے اندر پیدا کرلیں لیکن منظم و مربوط نہ ہوں' آپس میں متعاون نہ ہوں' شانہ سے شانہ ملا کر چل نہ سکیں تو ہم دنیا میں علم بردارانِ باطل کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ شخصی حیثیت سے بہترین انسان ہم میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ اور آج بھی موجود ہیں اور اگر آج دنیا بھر کو ہم چیلنج دے کر کہیں کہ ایسے لوگ کسی کے پاس نہ ہوں گے تو شاید اس چیلنج کا جواب کسی قوم سے نہ دیا جا سکے گا' مگر یہ معاملہ صرف انفرادی اصلاح کی حد تک ہے۔ جن لوگوں نے اپنی انفرادی اصلاح میں کمال حاصل کیا ہے انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ چند سو یا چند ہزار افراد پر اثر پھیلا دیا اور تقدس کی چند یادگاریں چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ یہ طریقہ بڑے کام کرنے کا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا پہلوان جو بھاری بوجھ اٹھانے اور کئی کئی آدمیوں کو کشتی میں پچھاڑنے کی طاقت رکھتا ہو' ایک مربوط رجمنٹ کے مقابلہ میں بالکل بے کار ہے۔ اسی طرح ہم میں سے کچھ لوگوں کی مثال انفرادی تزکیہ کی حیثیت سے اس پہلوان کی سی ہے جو کسی رجمنٹ کا عضو بن کر کام نہیں کرتا بلکہ منفرداً" ایک رجمنٹ کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے۔ انفرادی تزکیہ کے لحاظ سے ہماری اپنی جماعت میں بھی ایسے رفقاء کی کمی نہیں ہے جن کی حالت پر خود مجھے رشک آتا ہے مگر جہاں تک جماعتی تزکیہ کا تعلق ہے' حالات افسوس ناک ہیں... ہمیں دیکھنا ہو گا کہ جماعتی حیثیت سے کیا کچھ ترک کر دینے کے قابل ہے اور اس کی جگہ کیا کیا

چیزیں مطلوب ہیں۔

قرآن میں اس مسئلہ پر اصولی حد تک مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اور حدیث میں اس اصول کی مکمل تشریحات موجود ہیں۔ پھر سیرتِ نبویؐ اور سیرالصحابہؓ کے مطالعہ سے مطلوبہ اجتماعی اخلاق کے عملی نمونے بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ان چیزوں کی ورق گردانی کیجیے اور ناپ تول کر دیکھیے کہ کس پہلو سے ہمارے اجتماعی نظم میں کیا اور کتنی کمی ہے اور اس کمی کو پورا کرنے کی فکر کیجیے۔ صاف بات ہے کہ اجتماعی نظم میں ایک فرد کو دوسرے افراد سے لا محالہ سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر حسنِ ظن، ہمدردی، ایثار اور رواداری نہ ہو تو مزاجوں کا اختلاف تعاون کو چار دن بھی جاری نہیں رہنے دے گا۔ جماعتی نظم چلتا ہی اس اصول پر ہے کہ دوسروں کے لیے آپ اپنا کچھ چھوڑیں اور دوسرے آپ کے لیے کچھ چھوڑیں۔ اس ایثار کی ہمت نہ ہو تو کسی انقلاب کا نام بھی زبان پر نہ لانا چاہیے۔

مجاہدہ فی سبیل اللہ کے ضروری اوصاف

تیسری قسم کی صفات وہ ہیں جو مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لوازم میں شمار ہوتی ہیں۔ ان کا بھی قرآن و حدیث میں مفصل تذکرہ موجود ہے۔ صرف تذکرہ ہی نہیں، ایک ایک مطلوبہ صفت کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ وہ کس نوعیت اور کس درجہ کی ہونی چاہیے۔ اس سلسلہ میں احکام و ہدایت کو جمع کیجیے اور سمجھیے کہ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے کیا کیا تیاریاں کرنی ہیں۔ میں مختصراً ان کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلی صفت جس پر زور دیا گیا ہے، صبر ہے۔ صبر کے بغیر خدا کی راہ میں کیا کسی راہ میں بھی مجاہدہ نہیں ہو سکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خدا کی راہ میں اور قسم کا صبر مطلوب ہے اور دنیا کے لیے مجاہدہ کرتے ہوئے اور قسم کا صبر درکار ہے، بہرحال صبر ہے ناگزیر۔ صبر کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ جلد بازی سے اجتناب کیا جائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی راہ میں جدو جہد کرتے ہوئے دشواریوں اور مخالفتوں کے مقابلہ میں استقامت دکھائی جائے اور قدم پیچھے نہ ہٹایا جائے۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوششوں کا نتیجہ اگر جلدی حاصل نہ ہو تو تب بھی ہمت نہ ہاری جائے اور پیہم سعی جاری رکھی جائے۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ مقصد کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرات، نقصانات اور خوف و طمع کے مواقع بھی اگر پیش آ جائیں تو قدم کو لغزش نہ ہونے پائے اور یہ بھی صبر کا ہی ایک شعبہ ہے کہ اشتعالِ جذبات کے سخت سے سخت مواقع پر بھی آدمی اپنے ذہن کا توازن نہ کھوئے، جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اٹھائے۔ ہمیشہ سکون، صحتِ

عقل اور ٹھنڈی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرے۔ پھر حکم صرف صبر ہی کا نہیں مصابرت کا بھی ہے' یعنی مخالف طاقتیں اپنے باطل مقاصد کے لیے جس صبر کے ساتھ ڈٹ کر سعی کر رہی ہیں اسی صبر کے ساتھ آپ بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں اسی لیے "**اصبروا**" کے ساتھ "**صابروا**" کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ جن لوگوں کے مقابلہ میں آپ حق کی علمبرداری کے لیے اٹھنے کا داعیہ رکھتے ہیں ان کے صبر کا اپنے صبر سے موازنہ کیجیے اور سوچیے کہ آپ کے صبر کا کیا تناسب ہے ؟ شاید ہم ان کے مقابلہ میں ۱۰ فیصدی کا دعویٰ کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ باطل کے غلبہ کے لیے جو صبر وہ دکھا رہے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ جنگ کے حالات پر نظر ڈالیے۔ کس طرح وقت آ پڑنے پر ان لوگوں نے اپنے ان کارخانوں' شہروں اور ریلوے سٹیشنوں کو اپنے ہاتھوں سے پھونک ڈالا جن کی تعمیر و تیاری میں سالوں کی محنتیں اور بے شمار روپیہ صرف کیا گیا تھا۔ یہ ان ٹینکوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو فوجوں کو اپنے آہنی پہیوں تلے کچل ڈالتے ہیں۔ یہ دشمن کے ان بمبار طیاروں کے سائے میں استقامت سے کھڑے رہتے ہیں جو موت کے پر لگا کر اڑتے ہیں۔ جب تک ان کے مقابلہ میں ہمارا صبر ۵۰ فیصدی کے تناسب پر نہ پہنچ جائے ان سے کوئی ٹکر لینے کی جرات نہیں کی جا سکتی۔ جب سرو سامان کے لحاظ سے ہم ان کی سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تو پھر سرو سامان کی کمی کو صبر ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسری چیز جو مجاہدہ کا لازمہ ہے' ایثار کی صفت ہے۔ وقت کا ایثار' محنتوں کا ایثار اور مال کا ایثار۔ ایثار کے اعتبار سے بھی باطل کا جھنڈا اٹھانے والی طاقتوں کے مقابلہ میں ہم بہت ہی پیچھے ہیں' حالانکہ بے سرو سامانی کی تلافی کے لیے ہمیں ایثار میں بھی ان سے میلوں آگے ہونا چاہیے۔ مگر یہاں صورت واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص بیس' پچاس' سو اور ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کے عوض اپنی پوری صلاحیتیں خود اپنے دشمن کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس طرح ہماری قوم کا کار آمد جوہر بے کار ہو جاتا ہے۔ یہ دماغی صلاحیتیں رکھنے والا طبقہ اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ ایک بڑی آمدنی کو چھوڑ کر یہاں محض بقدرِ ضرورت قلیل معاوضہ پر اپنی خدمات پیش کر دے۔ پھر فرمایئے کہ اگر یہ لوگ اتنا ایثار بھی نہ کریں گے اور اس راہ میں پتہ مار کر کام نہ کریں گے تو پھر اسلامی تحریک کیسے پھل پھول سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی تحریک محض والنٹیروں کے بل پر نہیں چل سکتی۔ جماعتی نظم میں والنٹیروں کو اسی درجہ کی اہمیت حاصل ہے جیسے ایک آدمی کے نظام جسمانی میں ہاتھ اور پاؤں کو ہے۔ یہ ہاتھ اور پاؤں اور دوسرے اعضاء کس کام کے ہو سکتے ہیں اگر ان سے کام لینے کے لیے دھڑکنے والے دل اور سوچنے والے دماغ موجود نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں

ہمیں والنٹیروں سے کام لینے کے لیے اعلیٰ درجہ کے جنرل چاہئیں' مگر مصیبت یہ ہے کہ جن کے پاس دل اور دماغ کی قوتیں ہیں وہ دنیوی ترقیوں کے دلدادہ ہیں اور مارکیٹ میں اسی کی طرف جاتے ہیں جو زیادہ قیمت پیش کرے۔ نصب العین سے ہماری قوم کے بہترین افراد کی وابستگی ابھی اس درجہ کی نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنے منافع کو بلکہ منافع کے امکانات تک کو قربان کر سکیں۔ اس ایثار کو لے کر اگر آپ یہ توقع کریں کہ وہ مفسدینِ عالم جو روزانہ کروڑوں روپیہ اور لاکھوں جانوں کا ایثار کر رہے ہیں' ہم سے کبھی شکست کھا سکتے ہیں تو یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

(۳) مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے تیسری صفت دل کی لگن ہے۔ محض دماغی طور پر کسی شخص کا اس تحریک کو سمجھ لینا اور اس پر صرف عقلاً" مطمئن ہو جانا" یہ اس راہ میں اقدام کے لیے صرف ایک ابتدائی قدم ہے لیکن اتنے سے تاثر سے کام چل نہیں سکتا۔ یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں ایک آگ بھڑک اٹھے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آگ تو شعلہ زن ہو جانی چاہیے جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر ہو جایا کرتی ہے اور آپ کو کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے' یا اتنی جتنی گھر میں غلہ نہ پا کر بھڑکتی ہے اور آدمی کو تگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہیے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دھن میں لگائے رکھے' دل و دماغ یکسو کر دے اور توجہات کو اس کام پر ایسا مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ ان کی طرف کھنچیں۔ کوشش کیجئے کہ اپنی ذات کے لیے آپ قوت اور وقت کا کم سے کم حصہ صرف کریں اور آپ کی زیادہ سے زیادہ جدوجہد اپنے مقصد حیات کے لیے ہو۔ جب تک یہ دل کی لگن نہ ہو گی اور آپ ہمہ تن اپنے آپ کو اس کام میں جھونک نہ دیں گے' محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہ بنے گا۔ بیشتر لوگ دماغی طور پر ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو دل کی لگن کے ساتھ تن من دھن سے اس کام میں شریک ہوں۔ میرے ایک قریبی رفیق نے جن سے میرے ذاتی اور جماعتی تعلقات بہت گہرے ہیں' حال ہی میں دو برس کی رفاقت کے بعد مجھ سے یہ اعتراف کیا کہ اب تک میں محض دماغی اطمینان کی بنا پر شریک جماعت تھا مگر اب یہ چیز دل میں اتر گئی ہے اور اس نے نہاں خانۂ روح پر قبضہ جما لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص اسی طرح اپنے اوپر خود تنقید کر کے دیکھے کہ کیا ابھی تک وہ اس جماعت کا محض ایک دماغی رکن ہے یا اس کے دل میں مقصد عشق کی آگ مشتعل ہو چکی ہے۔ پھر اگر دل کی لگن اپنے اندر نہ محسوس ہو تو اسے پیدا کرنے کی فکر کی جائے۔ جہاں دل کی لگن

ہوتی ہے وہاں کسی ٹھیلنے اور اکسانے والے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس قوت کے ہوتے ہوئے یہ صورت حال کبھی پیدا نہیں ہو سکتی کہ اگر کہیں جماعت کا ایک رکن پیچھے ہٹ گیا یا نقل مقام پر مجبور ہو گیا تو وہاں کا سارا کام ہی چوپٹ ہو گیا۔ بخلاف اس کے پھر تو ہر شخص اس طرح کام کرے گا جس طرح وہ اپنے کو بیمار پا کر کیا کرتا ہے۔

خدانخواستہ اگر آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ اس کی زندگی و موت کے سوال کو بالکلیہ کسی دوسرے پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ ممکن نہیں کہ آپ یہ عذر کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ بیٹھیں کہ کوئی تیمار دار نہیں، کوئی دوا لانے والا نہیں، کوئی ڈاکٹر کے پاس جانے والا نہیں۔ اگر کوئی نہ ہو تو آپ خود سب کچھ بنیں گے کیونکہ بچہ کسی دوسرے کا نہیں آپ کا اپنا ہے۔ سوتیلا باپ تو بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ بھی سکتا ہے مگر حقیقی باپ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کیسے چھوڑ دے گا۔ اس کے تو دل میں آگ لگی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کام سے بھی اگر آپ کا قلبی تعلق ہو تو اس کو آپ دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ دوسرے کی نااہلی، یا غلط روی یا بے توجہی کو بہانہ بنا کر آپ اسے مرجانے دیں اور اپنے دوسرے مشاغل میں جا کر منہمک ہو جائیں، یہ سب باتیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ خدا کے دین اور اسکی اقامت و سربلندی کے مقصد سے آپ کا رشتہ محض ایک سوتیلا رشتہ ہے۔ حقیقی رشتہ ہو تو آپ میں سے ہر شخص اس راہ میں اپنی جان لڑا کر کام کرے۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر اس راہ میں کم از کم اتنے قلبی لگاؤ کے بغیر قدم بڑھائیں گے جتنا کہ آپ اپنی بیوی بچوں سے رکھتے ہیں تو انجام پسپائی کے سوا کچھ نہ ہو گا اور یہ ایسی پسپائی ہو گی کہ مدتوں تک ہماری نسلیں اس تحریک کا نام لینے کی جرات بھی نہ کر سکیں گی۔ بڑے بڑے اقدامات کا نام لینے سے پہلے اپنی قوت قلب کا اور اپنی اخلاقی طاقت کا جائزہ لیجئے اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے جس دل گردے کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجیے۔

(۴) چوتھی ضروری صفت اس راہ میں یہ ہے کہ ہمیں مسلسل اور پیہم سعی اور منضبط (systematic) طریقہ سے کام کرنے کی عادت ہو۔ ایک مدت دراز سے ہماری قوم اس طریق کار کی عادی رہی ہے کہ جو کام ہو کم سے کم وقت میں ہو جائے۔ جو قدم اٹھایا جائے ہنگامہ آرائی اس میں ضرور ہو۔ چاہے مہینہ دو مہینہ میں سب کیا کرایا غارت ہو کر رہ جائے اس عادت کو ہمیں بدلنا ہے۔ اس کی جگہ بتدریج اور بے ہنگام کام کرنے کی مشق ہونی چاہیے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی، جو بجائے خود ضروری ہو، اگر آپ کے سپرد کر دیا جائے تو بغیر کسی نمایاں اور معجل نتیجہ کے اور بغیر کسی داد کے آپ اپنی پوری عمر صبر کے ساتھ اسی کام میں کھپا دیں۔ مجاہدہ فی سبیل

بقیہ بر صفحہ ۴۷

فہم قرآن: تفاسیر کی روشنی میں

اخذ و ترتیب: خرّم مراد

خبر اور تحقیق

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○ (الحجرات ۴۹: ۶)

اے ایمان والو! اگر آئے تمہارے پاس کوئی گنہگار خبر لے کر' تو تحقیق کرلو' کہیں جا نہ پڑو کسی قوم پر نادانی سے' پھر کل کو اپنے کیے پر لگو پچھتانے۔

(موضح الفرقان: شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر پشیمان ہو

(تفہیم القرآن: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

مواہب الرحمان: مولانا امیر علیؒ

ایمان لانے والو! اگر فاسق تمہارے پاس خبر لاوے تو اس کو صاف معلوم کرلو۔ تبیین میں بہ نسبت بیان کے بھی مبالغہ ہے۔ اور بیان بمعنی ظاہر ہونا و کھل جانا۔ پس تبیین خوب ظاہر ہونا اور خوب ظاہر جان لینا۔ اور فاسق نکرہ' ہے یعنی کوئی فاسق ہو۔ اور نباء بھی نکرہ' ہے یعنی کوئی خبر ہو' خواہ وہ امر دنیا سے متعلق ہو یا امر دین سے متعلق ہو۔ اس واسطے کہ اہلِ ایمان کے واسطے کوئی امرِ دنیاوی ایسا نہیں ہے جس کا انجام دین کی جانب راجع نہ ہو' کیونکہ دنیا سے وہ لوگ آخرت ہی کی کمائی چاہتے ہیں۔ پس اگر دنیاوی امور میں بغیر تفتیش کے فاسق کی بات مان لی جائے تو اس کا انجام

یہ ہے کہ دین میں خرابی پیدا ہو' لہٰذا ہر فاسق کی عام خبر سے احتراز کا حکم فرمایا' کہ اے اہلِ ایمان اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کسی قسم کی خبر لاوے تو اس کو تفتیش کر کے خوب صاف کر لو' کیونکہ اس کے قبول کرنے میں تمہارے دین و دنیا کا ضرر ہے بلکہ وہ تمہارے درمیان اس حیلہ سے فساد ڈالے گا۔

ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو بغیر جانے مصیبت پہنچاؤ' تو آخر اپنے کیے پر شرمندہ ہو جاؤ۔ مثلاً فاسق نے اپنے فسق کی وجہ سے اہلِ ایمان کے درمیان فساد ڈالنا چاہا۔ پس اس نے ایک مسلمان قوم کی طرف سے امام کو اور اس کی جماعت کو جھوٹی خبر پہنچائی' اور انہوں نے بغیر تحقیق کے اس قوم پر چڑھائی کی۔ اور فاسق نے اس قوم کو یہ خبر پہنچائی کہ خلیفہ و اس کی جماعت کے لوگ' یعنی سلطان وغیرہ چاہتے ہیں کہ تم لوگوں کو گرفتار کر کے تمہارا مال لے لیں۔ اور ان لوگوں نے بھی اس کی بات پر اعتماد کر لیا اور لڑنے پر آمادہ ہوئے' اور آپس میں کہا کہ حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ مومن اپنے نفس کو ذلیل نہیں کرتا تو ناانصافی کے طریقے میں کیوں ہم لوگ ناحق اپنے نفس کو ذلیل کریں' جبکہ ہمارا قصور نہیں ہے۔ رہا یہ خیال کہ جماعت کے مقابلہ میں ہم لوگ مارے جاویں گے تو ہم کو اس کا خوف نہ کرنا چاہیے 'کہ اچھے طریقے سے مرنا بہتر ہے' اور دنیا سے عاقبت بہتر ہے' اور حدیث سے ثابت ہے کہ جو کوئی اپنے مال و آبرو کے پیچھے مارا گیا وہ شہید ہے' تو ہم بھی کے شہادت کے واسطے تیار ہیں۔ آخر فاسق کی جھوٹی چنگاری سے ایک قوم کو مصیبت پہنچی اور امام و سلطان و جماعت نے بھی نادانی سے ان کو شہید کیا۔ پھر جب حقیقتِ حال کھلی تو اپنے بھائیوں کے قتل پر غمناک و شرمندہ ہوئے۔ اور یہ سب اسی وجہ سے پیش آیا کہ فاسق کی خبر کو بغیر تفتیش کے مان لیا گیا تھا۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں قرآن مجید نازل فرمایا' بلکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں بطور مثال کے ایک واقعہ بھی جاری فرمایا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ فاسق کی خبر سے کس قدر اہتمام کے ساتھ پرہیز رکھنا واجب ہے' اور بداحتیاطی کرنے میں کہاں تک بھائیوں و عزیزوں کے جان و مال کا خوف ہوتا ہے۔ . . .

اللہ تعالیٰ نے فاسق کی بات سننے سے یا بدوں تفتیش کے اس کی تصدیق کرنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ وہ فسق کرنے میں شیطان کا متبع ہے' تو ایسا نہ ہو کہ شیطان اس کے ذریعہ مسلمانوں میں فساد پھیلادے۔

اور فساد کے وجوہ ہوتے ہیں' جن میں سب سے زیادہ سخت وہ وجہ ہے جو دین کے پیرایہ میں ہو۔ یعنی مثلاً فاسق نے دین میں کوئی بدعت نکالی' اور اس کو بہتر سمجھا' اور جب اہلِ حق نے اس

کو روکا تو اس نے اہلِ حق کو دین سے مخالف سمجھ کر قابلِ قتل قرار دیا۔ جیسے خوارج و معتزلہ وغیرہ ہیں۔

اور ابتداء میں بغاوت اسی وجہ سے پھیل گئی۔ اور اس کا شروع ہونا بہت ہی باریک اجتہاد سے ہوا' کیونکہ حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا' کہ آنحضرتؐ نے ... حضرت علیؓ کے حق میں دعا فرمائی کہ الٰہی' جدھر یہ پھرے تو حق ہی کے ساتھ ہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوگیا کہ ہر ایک قتال میں حق انہیں کے ساتھ تھا۔ لیکن دوسری جانب اہلِ جمل و اہلِ صفین بھی باریک اجتہاد میں خطا کھاتے تھے۔ کیونکہ اگر ظاہر اجتہاد ہوتا تو آنحضرتؐ کی دعا کی بھی چنداں ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ جو امرِ حق کہ بالکل ظاہر ہے اس سے پھرنا سب پر ظاہر ہوجاتا ہے۔ حالانکہ ان لڑائیوں میں جو لوگ کہ حضرت علیؓ کے مقابل تھے وہ خود بھی مشوش تھے' اور ایک جماعت کثیر صحابہؓ میں سے دونوں کی جانب سے مشوش تھے۔

آنحضرت نے بطور معجزہ فرقہ خارجی کی خبر بیان فرمائی .... کہ اس فرقہ کو مومنوں سے وہ فرقہ قتل کرے گا جو اولیٰ بالحق ہے۔ لفظ اولیٰ بالحق سے صریح اشارہ ہے کہ اجتہاد ایسا دقیق ہوگا کہ دونوں جانب حق کا احتمال ہوگا' اگرچہ ایک جانب اولیٰ ہے۔ ... بالجملہ بغاوت کی ابتدا ایسی وجہ سے ہوئی جو نہایت دقیق تھی۔

بیان القرآن: مولانا اشرف علی تھانویؒ

اے ایمان والو (جس طرح ولید بن عقبہ کی خبر پر' باوجودیکہ ولید محکوم علیہ بالفسق نہیں' رسول اللہ علیہ وسلم نے عمل کرنے میں جلدی نہیں کی' بلکہ اس کی تحقیق فرمائی' جس سے ایک حکم شرعی ثابت ہوگیا کہ بدون تحقیق کے ایسی خبر پر عمل نہ کرنا چاہیے' اور اوپر تم کو معلوم ہوچکا ہے کہ حکم شرعی سے سبقت کرنا منہی عنہ ہے' بس لامحالہ اس حکم شرعی سے بھی سبقت منہی عنہ ہوگی۔

اور جب غیر محکوم علیہ بالفسق میں یہ حکم ہے' تو فاسق کے باب میں تو بدرجہ اولیٰ اس لیے ہم تم کو اہتمام کے لیے مکرر حکم دیتے ہیں کہ) اگر کوئی شریر آدمی تمہار پاس کوئی خبر لاوے' (جس میں کسی کی شکایت ہو)' تو (بدوں تحقیق کے اس پر عمل مت کیا کرو' بلکہ اگر عمل کرنا ہو تو) خوب تحقیق کرلیا کرو' کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو' پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

مطلب یہ کہ جیسا اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے ایسا ہی تم کو کرنا

چاہیے' کہ اس کے خلاف وہی تقدیم بین یدی اللہ ورسولہ ہے جس کی ممانعت ہو چکی ہے۔ پس یا ایھا الذین امنوا میں مخاطب عام مومنین ہیں' اور فاسق سے مراد عام فاسقین ہیں' اور فاسق کا ذکر افادہ مبالغہ فی الحکم کے لیے ہے یہ نہیں کہ جس قصہ میں اس کا نزول ہوا ہے اس کو فاسق کہا گیا ہو۔ پس اس آیت سے نہ ولید کا فاسق ہونا لازم آیا اور نہ اس کا شبہ رہا کہ یہ موہم ہے کہ آپ نے بے تحقیق کچھ کارروائی کرنا چاہا ہوگا۔ وجۂ دفعِ شبہہ ظاہر ہے کہ آپؐ اس میں مخاطب نہیں بلکہ عام مومنین کو حکم ہے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدا کرو' اور اس خبر سے مراد مطلق خبر نہیں ہے بلکہ جس پر عمل کرنے سے کسی کا ضرر لازم آتا ہو۔ بقرینہ ان تصیبوا الخ ۔ تو اس محتمل الفسق و مقطوع الفسق دونوں کی خبر غیر مقبول ہے۔ پس اس مقام پر مطلقاً خبر واحد کے مقبول یا غیر مقبول ہونے کی تفصیل سے بحث کرنا امرِ زائد ہے۔ اسی طرح صحابہؓ کے عدول وغیر عدول ہونے کی بحث کرنا امرِ زائد ہے۔ کیونکہ ولید کا فاسق ہونا آیت سے لازم ہی نہیں آتا بلکہ نہ حدیث سے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ ولید کو خود گمان میں غلطی ہوئی ہو۔

اور فَتَبَيَّنُوٓا سے یہ مقصود نہیں کہ ضرور اس خبر کی تحقیق کی جاوے۔ کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ اگر ہم کسی شخص کی برائی سن کر بالکل التفات نہ کریں' جائز ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو تجسس حرام ہے۔ بلکہ مقصود اس سے نہی ہے عمل بلا تحقیق سے' جیسا کہ تقریر ترجمہ میں ظاہر کردیا ہے۔

اور یہ مسئلہ مستقل ہے کہ تحقیق کہاں واجب ہے' کہاں جائز ہے' کہاں ممنوع ہے۔ سو اس میں قولِ مجمل یہ ہے کہ جہاں تحقیق نہ کرنے سے کوئی واجبِ شرعی فوت ہوتا ہو وہاں واجب ہے۔ مثلاً سلطان کسی کے ارتداد کی خبر سنے تو چونکہ ارتداد کی صورت میں اس پر واجب ہے کہ اس کو توبہ کرادے ورنہ قتل کرے اس لیے تحقیق واجب ہوگی۔ یا سلطان نے سنا کہ فلاح شخص فلاں کو قتل کرنا چاہتا ہے تو چونکہ بوجہ سلطان ہونے کے حفاظت رعایا کی اس کے ذمہ واجب ہے اس لیے اس کی تحقیق اور انتظام واجب ہے۔ اور جہاں تحقیق نہ کرنے سے کوئی واجب فوت نہیں ہوتا اور تحقیق کرنے سے اس مبلغ عنہ کا بھی کوئی ضرر نہیں ہوتا تو وہاں تحقیق جائز ہے۔ جیسے یہ سنا کہ فلاں شخص مجھ کو مارے گا۔ اور اگر تحقیق کرنے سے اپنی کوئی دفعِ مضرت نہیں' اور اس دوسرے کو ناگواری ہے' تو تحقیق حرام ہے۔ جیسے کسی نے سنا کہ فلاں شخص خفیہ شراب پیتا ہے۔ تو تحقیق نہ کرنے سے اپنا کوئی ضرر نہیں اور تحقیق کرنے سے وہ فضیحت ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لیا جاوے۔

معارف القرآن: مفتی محمد شفیعؒ

اس آیت کے نزول کا واقعہ ابنِ کثیر نے بحوالہ مسند احمد یہ نقل کیا ہے کہ قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس حارث بن ضرار بن ابی ضرار، جن کی صاحبزادی حضرت جویریہؓ بنت حارث امہات المومنین میں سے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا۔ میں نے اسلام کو قبول کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار کیا، اور عرض کیا کہ اب میں اپنی قوم میں جا کر ان کو بھی اسلام اور ادائے زکوٰۃ کی طرف دعوت دوں گا۔ جو لوگ میری بات مان لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے، میں ان کی زکوٰۃ جمع کرلوں گا۔ اور آپؐ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ تک اپنا کوئی قاصد میرے پاس بھیج دیں تاکہ جو رقم زکوٰۃ کی میرے پاس جمع ہوجائے اس کو سپرد کردوں۔ پھر جب حارث نے حسب وعدہ ایمان لانے والوں کی زکوٰۃ جمع کرلی، اور وہ مہینہ اور تاریخ جو قاصد بھیجنے کے لیے طے ہوئی تھی گزر گئی، اور آپؐ کا کوئی قاصد نہ پہنچا تو حارث کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں، ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ آپؐ وعدے کے مطابق اپنا آدمی نہ بھیجتے۔ حارث نے اس خطرہ کا ذکر اسلام قبول کرنے والوں کے سرداروں سے کیا اور ارادہ کیا کہ یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوجاویں۔ ادھر واقعہ یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقررہ تاریخ پر ولید بن عقبہؓ کو اپنا قاصد بنا کر زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیج دیا تھا، مگر ولید بن عقبہ کو راستہ میں یہ خیال آیا کہ اس قبیلہ کے لوگوں سے میری پرانی دشمنی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے قتل کرڈالیں۔ اس خوف کے سبب وہ راستہ ہی سے واپس ہوگئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر یہ کہا کہ ان لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا، اور میرے قتل کا ارادہ کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آیا، اور حضرت خالدؓ بن ولید کی سرکردگی میں ایک دستہ مجاہدین کا روانہ کیا۔ ادھر یہ دستہ مجاہدین کا روانہ ہوا، ادھر سے حارث مع اپنے ساتھیوں کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے نکلے۔ مدینہ کے قریب دونوں کی ملاقات ہوئی۔ حارث نے ان لوگوں سے پوچھا کہ آپ کن لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔ حارث نے سبب پوچھا تو ان کو واقعہ ولید بن عقبہ کے بھیجنے کا اور ان کی واپسی کا بتلایا گیا، اور یہ کہ ولید بن عقبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ بنی المصطلق نے زکوٰۃ دینے

سے انکار کردیا' اور میرے قتل کا منصوبہ بنایا۔ حارث نے یہ سن کر کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ برحق بنا کر بھیجا ہے' میں نے ولید بن عقبہ کو دیکھا تک نہیں' اور نہ وہ میرے پاس آئے۔ اس کے بعد حارث جب رسول اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا' اور میرے قاصد کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حارث نے کہا کہ ہرگز نہیں' قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو پیغام حق دیکر بھیجا ہے' نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں نے ان کو دیکھا۔ پھر جب مقررہ وقت پر آپؐ کا قاصد نہ پہنچا تو مجھے خطرہ ہوا کہ شاید مجھ سے کوئی قصور ہوا جس پر حضورؐ ناراض ہوئے اس لیے میں حاضر خدمت ہوا۔ حارثؓ فرماتے ہیں کہ اس پر سورۂ حجرات کی آیت نازل ہوئی (ابن کثیر)

اور بعض روایات میں ہے کہ ولید بن عقبہ حسب الحکم نبی المصطلق میں پہنچے۔ اس قبیلہ کے لوگوں کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ اس تاریخ پر حضورؐ کا قاصد آوے گا۔ یہ تعظیماً" بستی سے باہر نکلے کہ ان کا استقبال کریں۔ ولید بن عقبہ کو شبہ ہوگیا کہ یہ شاید پرانی دشمنی کی وجہ سے مجھے قتل کرنے آئے ہیں۔ یہیں سے واپس ہوگئے' اور جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے گمان کے مطابق یہ عرض کردیا کہ وہ لوگ زکوٰۃ دینے کے لیے تیار نہیں' بلکہ میرے قتل کے درپے ہوئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بھیجا' اور یہ ہدایت فرمائی کہ خوب تحقیق کرلیں' اس کے بعد کوئی اقدام کریں۔ خالدؓ بن ولید نے بستی سے باہر رات کو پہنچ کر قیام کیا' اور تحقیق حال کے لیے چند آدمی بطور جاسوس کے خفیہ بھیج دیئے۔ ان لوگوں نے آکر خبر دی کہ یہ سب لوگ اسلام و ایمان پر قائم' نماز و زکوٰۃ کے پابند ہیں' اور کوئی بات خلاف اسلام نہیں پائی گئی۔ خالدؓ بن ولید نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ بتلایا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (یہ ابن کثیر کی متعدد روایات کا خلاصہ ہے)

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ کوئی شریر فاسق آدمی اگر کسی شخص یا قوم کی شکایت کرے ان پر کوئی الزام لگائے تو اسکی خبر یا شہادت پر بغیر مکمل تحقیق کے عمل کرنا جائز نہیں۔

آیت سے متعلقہ احکام و مسائل

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی فاسق کی خبر کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک دوسرے ذرائع سے تحقیق کرکے اس کا صدق ثابت نہ ہو جائے' کیونکہ اس آیت میں ایک قرات تو فتثبتوا کی ہے' جس کے معنی ہیں کہ اس پر عمل کرنے اور اقدام میں جلدی نہ کرو' بلکہ ثابت قدم رہو' جب تک دوسرے

ذرائع سے اس کا صدق ثابت نہ ہو جائے۔ اور جب فاسق کی خبر کو قبول کرنا جائز نہ ہوا' تو شہادت کو قبول کرنا بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا' کیونکہ ہر شہادت ایک خبر ہوتی ہے جو حلف و قسم کے ساتھ موکد کی جاتی ہے۔ اسی لیے جمہور علماء کے نزدیک فاسق کی خبریا شہادت شرعاً" مقبول نہیں۔ البتہ بعض معاملات اور حالات میں فاسق کی خبر اور شہادت کو بھی قبول کرلیا جاتا ہے۔ وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ آیتِ قرآن میں اس حکم کی ایک خاص علت منصوص ہے' یعنی ان تصیبوا قوما بجھالتہ۔ تو جن معاملات میں یہ علت موجود نہیں' وہ آیت کے حکم میں داخل نہیں یا مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی فاسق بلکہ کافر بھی کوئی چیز لائے اور یہ کہے کہ فلاں شخص نے یہ آپ کو ہدیہ بھیجا ہے تو اس کی خبر پر عمل جائز ہے۔ اس کی مزید تفصیل کتبِ فقہ معین الحکام وغیرہ میں ہے۔

ایک اہم سوال و جواب متعلقہ عدالتِ صحابہ

اس آیت کا ولید بن عقبہؓ کے متعلق نازل ہونا صحیح روایات سے ثابت ہے' اور آیت میں ان کو فاسق کہا گیا ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں کوئی فاسق بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ اس مسلمہ اور متفق علیہ ضابطہ کیخلاف ہے کہ الصحابتہ کلھم عدول' یعنی صحابہ کرام سب کے سب ثقہ ہیں' ان کی کسی خبر و شہادت پر کوئی گرفت نہیں کی جاسکتی۔

علامہ آلوسی نے روح المعانی میں فرمایا کہ اس معاملے میں حق بات وہ ہے جس کی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام معصوم نہیں' ان سے گناہ کبیرہ بھی سرزد ہوسکتا ہے جو فسق ہے۔ اور اس گناہ کے وقت ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں' یعنی شرعی سزا جاری کی جائے گی' اور اگر کذب ثابت ہوا تو ان کی خبر و شہادت رد کردی جائے گی۔

لیکن عقیدہ اہل سنت والجماعت کا نصوص قرآن و سنت کی بنا پر یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہوسکتا ہے' مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کرکے پاک نہ ہوگیا ہو۔ قرآن کریم نے علی الاطلاق ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے۔ رضی اللہ عنھم ورضواعنہ (للآیتہ)' اور رضائے الٰہی گناہوں کی معافی کے بغیر نہیں ہوتی۔ جیسا کہ قاضی ابو یعلیٰ نے فرمایا کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ قدیمہ ہے' وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انہی کے لیے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ ان کی وفات موجبات رضا پر ہوگی۔ (کذا فی الصارم المسلول لابن تیمیہ)

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی عظیم الشان جماعت میں سے گنے چنے چند آدمیوں سے کبھی کوئی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو ان کو فوراً توبہ نصیب ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ نے ان کو رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت ان کی طبیعت بن گئی تھی۔ خلافِ شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا۔ ان کے اعمالِ صالحہ' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا' اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو وظیفہ زندگی بنانا' اور اس کے لیے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر پچھلی امتوں میں نہیں ملتی۔ ان بے شمار اعمالِ صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہوجانا اس کو خود ہی کالعدم کردیتا ہے۔

دوسرے' اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور ادنیٰ سے گناہ کے وقت ان کا خوف و خشیت اور فوراً توبہ کرنا' بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لیے خود پیش کردینا' کہیں اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دینا وغیرہ' روایاتِ حدیث میں معروف و مشہور ہیں' اور بحکمِ حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہوجاتا ہے کہ جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔

تیسرے' حسبِ ارشادِ قرآن' اعمالِ صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہوجاتے ہیں۔ ان الحسنات یذھبن السیئات۔ خصوصاً جبکہ ان کے حسنات عام لوگوں کی طرح نہیں' بلکہ ان کا حال وہ ہے جو ابوداؤد و ترمذی نے حضرت سعیدؓ بن زید سے نقل کیا ہے کہ **"واللہ لمشھد رجل منھم مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یغبر فیہ وجھہ خیر من عمل احدکم ولو عمر عمر نوح"** یعنی خدا کی قسم ان میں سے کسی شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جس میں ان کے چہرہ پر غبار پڑ گیا ہو' تمہاری عمر بھر کی طاعت و عبادت سے افضل ہے' اگرچہ اس کو عمر نوح علیہ السلام دیدی گئی ہو۔

اس لیے ان سے صدورِ گناہ کے وقت اگرچہ سزا وغیرہ میں معاملہ وہی کیا گیا جو اس جرم کے لیے مقرر تھا مگر اس کے باوجود بعد میں کسی کے لیے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کو فاسق قرار دے۔ اس لیے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کسی صحابی سے کوئی گناہ موجبِ فسق سرزد بھی ہو' اور اس وقت ان کو فاسق کہا بھی گیا' تو اس سے یہ جائز نہیں ہوجاتا کہ اس فسق کو ان کے لیے مستمر سمجھ کر معاذ اللہ فاسق کہا جائے۔ (کذا فی الروح)

اور آیتِ مذکورہ میں تو قطعاً یہ ضروری نہیں کہ ولید بن عقبہ کو فاسق کہا گیا ہو۔ سببِ نزول خواہ ان کا معاملہ ہی سہی' مگر لفظ فاسق ان کے لیے استعمال کیا گیا یہ ضرور نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تو ولید بن عقبہ سے کوئی ایسا کام ہوا نہ تھا جس کے سبب ان کو فاسق کہا جائے۔ اور اس واقعہ میں بھی جو انہوں نے بنی المصطلق کے لوگوں کی طرف ایک بات غلط منسوب

کی وہ بھی اپنے خیال کے مطابق صحیح سمجھ کر کی' اگرچہ واقع میں غلط تھی۔ اس لیے آیتِ مذکورہ کا مطلب بے تکلف وہ بن سکتا ہے جو خلاصۂ تفسیر میں اوپر گزرا ہے کہ اس آیت نے قاعدہ کلیہ فاسق کی خبر کے نامقبول ہونے کے متعلق بیان کیا ہے' اور واقعہ مذکورہ پر اس آیت کے نزول سے اس کی مزید تاکید اس طرح ہو گئی کہ ولید بن عقبہ اگرچہ فاسق نہ تھے مگر ان کی خبر قرائنِ قویہ کے اعتبار سے ناقابلِ قبول نظر آئی' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ان کی خبر پر کسی اقدام سے گریز کر کے خالدؓ بن ولید کو تحقیقات پر مامور فرما دیا۔ تو جب ایک ثقہ اور صالح آدمی کی خبر میں، قرائن کی بنا پر شبہ ہو جانے کا معاملہ یہ ہے کہ اس پر قبل از تحقیق عمل نہیں کیا گیا' تو فاسق کی خبر کو قبول نہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا اور زیادہ واضح ہے۔

تدبرِ قرآن : مولانا امین احسن اصلاحی

یہ مرکز (یعنی مدینہ) کے مسلمانوں کو اس طرح کے لوگوں کی طرف سے ایک سیاسی خطرہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اطرافِ مدینہ کے بدوی قبائل کے بعض سرداروں کا رویہ بیان ہوا ہے۔ ان کے اندر تربیت سے محرومی کے باعث جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا صحیح شعور مفقود تھا' اسی طرح اسلامی اخوت کے صحیح احساس سے بھی یہ لوگ ابھی ناآشنا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کے اندر جو رقابتیں اور رنجشیں آپس میں تھیں ان کے اثرات ہنوز باقی تھے۔ یہ لوگ مدینہ آتے تو ان میں سے بعض اپنے حریفوں کے خلاف غلط سلط اطلاعات دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بدگمان کرنے کی کوشش کرتے' اور صحابہؓ میں سے بھی' جن پر ان کا اثر کارگر ہوتا' ان کو اپنے حق میں ہموار کرتے' تاکہ مدینہ کی مرکزی طاقت کو اپنے حریفوں کے خلاف اپنے حق میں استعمال کر سکیں۔ یہ صورتِ حال ایک نازک صورتِ حال تھی۔ مدینہ کی حکومت اوّل تو ابھی اچھی طرح مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ ثانیاً اس قسم کی بے بنیاد افواہ انگیزیوں کی بنا پر اس کا کوئی اقدام خاص طور پر مسلمانوں کے کسی گروہ کے خلاف' عدل اور اجتماعی مصلحت دونوں کے خلاف ہوتا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ مرکز کے مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی جائے کہ وہ اس طرح کے اہم معاملات میں فیصلہ کلیتہ" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب دید پر چھوڑیں' غیر ثقہ لوگوں کی روایات پر اعتماد کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رائے سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ ان کو ہدایت ہوئی کہ اگر کوئی فاسق شخص کسی اہم بات کی خبر دے تو نفسِ واقعہ کی اچھی طرح تحقیق کیے بغیر اس کی بات پر اعتماد کر کے کوئی

اقدام نہ کر بیٹھو' مبادا کہ تم جوش و جذبہ سے مغلوب ہو کر کسی بے گناہ گروہ کے خلاف اقدام کر گزرو جس پر تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔

فاسق سے مراد شریعت کے حدود و قیود سے بے پروا لوگ ہیں۔ لفظ "نباء' کی تحقیق اس کے محل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی اہم خبر ہوتی ہے' جس کو باور کر لینے یا اس پر عمل کرنے سے دور رس نتائج کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس طرح کی اہم خبر اگر کوئی ایسا شخص دے جو دینی و اخلاقی اعتبار سے ناقابل اعتبار ہو تو عقل اور اخلاق دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی بات اس وقت تک باور نہ کی جائے جب تک خبر اور مخبر دونوں کی اچھی طرح تحقیق نہ کر لی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ خبر دینے والے نے فاسد محرکات کے تحت خبر دی ہو۔ اور خبر یا تو بالکل جھوٹی ہو۔ یا کسی بدنیتی سے اس میں ایسی کمی بیشی کر دی گئی ہو کہ سننے والوں کے جذبات میں اس سے جوش و اشتعال پیدا ہوا۔ لفظ جہالت ' یہاں جوش و ہیجان کے معنی میں ہے۔

...

آیت کی شان نزول کو درایت کی کسوٹی پر جانچیے تو معلوم ہو گا کہ اس کی کوئی کَل بھی سیدھی نہیں ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت میں فاسق کی روایت پر اعتماد کرنے سے روکا گیا ہے جب کہ ولیدؓ کے متعلق اس واقعے سے پہلے کوئی بات بھی ایسی لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھی جس سے معلوم ہو سکتا کہ نعوذ باللہ وہ فاسق ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ان کے فسق کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی بلکہ ان کی ثقاہت و عدالت کا یہ مرتبہ تھا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تحصیلِ زکوٰۃ کے ذمہ دارانہ منصب پر مامور فرمایا۔ اگر ان کے اندر اس قسم کا کوئی کھوٹ ہوتا تو حضورؐ ان کو اس اہم خدمت کے لیے کس طرح منتخب فرماتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس شانِ نزول کو باور کر لیجیے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ "نعوذ باللہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سے اتنے ناواقف تھے کہ ایسے لوگوں کو ذمہ دارانہ مناصب پر مامور فرما دیتے تھے جو اپنی دروغ بافی سے حکومت اور رعایا دونوں کو خطرے میں ڈال دیں۔ اس قسم کے بے بصیرتی ایک عام معقول آدمی سے بھی بعید از قیاس ہے چہ جائے کہ اس کا صدور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر ولیدؓ استقبال کرنے والی پارٹی کو جنگجو پارٹی سمجھ کر اس سے ڈر کے واپس آگئے تھے اور اپنا تاثر انہوں نے حضورؐ کے سامنے یہ بیان کیا کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ ادا

کرنے سے انکار کردیا ہے تو ان کی یہ بات سادہ لوحی اور کمزوری تو قرار دی جاسکتی ہے لیکن ازروئے شریعت اس کو فسق نہیں کہا جاسکتا۔ پھر تو اس مضمون کی آیت اترنی تھی کہ مسلمانو' تم اپنے ذمہ دارانہ عہدے ایسے سادہ لوحوں کے سپرد نہ کیا کرو جو استقبال کرنے والوں اور لڑنے والوں کے درمیان امتیاز کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ولیدؓ اتنے سادہ لوح ہوتے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایسی اہم مالی اور سیاسی ذمہ داری سپرد کردیتے ؟ کیا کسی شخص کے اندر سادہ لوحی کوئی ناگہانی طور پر پیدا ہو جانے والی چیز ہے جو لوگوں سے مخفی رہے' یہاں تک کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا اندازہ نہ ہوسکے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ یہی ولیدؓ ہیں جن کو سیدنا عثمان غنیؓ نے اپنے دور خلافت میں کوفہ کا گورنر بنایا۔ غور کیجیے کہ کیا حضرت عثمان غنیؓ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ یہ شخص ازروئے نصِ قرآن فاسق قرار پاچکا ہے اور گورنری تو درکنار اسلامی قانون کی رو سے یہ کسی روایت یا شہادت کا بھی اہل نہیں ہے ؟ اگر ناواقف تھے تو یہ مانیے کہ حضرت عثمانؓ جیسے خلیفہء راشد' جن کو جامع قرآن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے "نعوذ باللہ" قرآن کا اتنا علم بھی نہیں رکھتے تھے جتنا علم شانِ نزول کی روایتیں کرنے والے ان راویوں کو تھا۔

میں نے اس شانِ نزول کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے' ورنہ اضطراب اس کے ہر پہلو میں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تادیبی دستہ روانہ کردیا تھا' بعض میں ہے کہ روانہ کرنے کا فیصلہ فرمالیا تھا اور بنی مصطلق کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر تم لوگ اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمہاری سرکوبی کے لیے ایسے شخص کو بھیجوں گا جو **عندی کنفسی** (جو میرے نزدیک میری اپنی ذات کی طرح ہے) ساتھ ہی حضرت علیؓ کے شانے پر تھپتھپاتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی کہ اس مہم کو یہ سر کریں گے۔ بعض روایات میں اس کے برخلاف یہ ہے کہ اس مہم پر آپؐ نے حضرت خالدؓ کو بھیجا۔ غرض جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں' حالانکہ **لویطیعکم فی کثیرمن الامر** ' سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح کی کوئی بات آئی بھی تو آپؐ نے ٹال دی اور لوگوں کو تنبیہہ کردی گئی کہ وہ پیغمبرؐ کو اپنی رایوں سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔

میرے نزدیک یہ شانِ نزول روافض کی "ایجادات" میں سے ہے جس سے انہوں نے صرف ولیدؓ ہی کو بدنام کرنا نہیں چاہا ہے بلکہ حضرت عثمانؓ کو بھی مطعون کرنے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے یہ جانتے بوجھتے کہ یہ شخص فاسق ہے محض از راہِ کنبہ پروری اس کو کوفہ کا گورنر بنا

دیا۔ پھر کوفہ کی گورنری کے دوران میں ان ظالموں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ ان کے فسق کے ایسے واقعات کی روایت کی ہے جن کو سن کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ ہنسی ان ظالموں کی ذہانت پر آتی ہے اور رونا اپنے مفسرین کی سادگی پر کہ اس قسم کی بے سروپا روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل کر دیتے ہیں' حالانکہ آیت کے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق سے ان کو کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

تفہیم القرآن : مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ . . . تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس قصے کو امام احمد' ابن ابی حاتم' طبرانی اور ابن جریر نے حضرات عبداللہ بن عباس' حارث بن ضرار' مجاہد' قتادہ' عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ' یزید بن رومان' ضحاک اور مقاتل بن حیان سے نقل کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ کی روایت میں یہ پورا قصہ بیان تو اسی طرح ہوا ہے مگر اس میں ولید کے نام کی تصریح نہیں ہے۔

اس نازک موقع پر جبکہ ایک بے بنیاد خبر پر اعتماد کرلینے کی وجہ سے ایک عظیم غلطی ہوتے ہوتے رہ گئی' اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اصولی ہدایت دی کہ جب کوئی اہمیت رکھنے والی خبر' جس پر کوئی بڑا نتیجہ مترتب ہوتا ہو' تمہیں ملے تو اس کو قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھ لو کہ خبر لانے والا کیسا آدمی ہے۔ اگر وہ کوئی فاسق شخص ہو' یعنی جس کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ اس کی بات اعتماد کے لائق نہیں ہے' تو اس کی دی ہوئی خبر پر عمل کرنے سے پہلے تحقیق کرلو کہ امرِ واقعہ کیا ہے۔

اس حکمِ ربانی سے ایک اہم شرعی قاعدہ نکلتا ہے جس کا دائرہ اطلاق بہت وسیع ہے۔ اس کی رو سے مسلمانوں کی حکومت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا قوم کے خلاف کوئی کارروائی ایسے مخبروں کی دی ہوئی خبروں کی بنا پر کر ڈالے جن کی سیرت بھروسے کے لائق نہ ہو۔ اسی قاعدے کی بنا پر محدثین نے علمِ حدیث میں جرح و تعدیل کا فن ایجاد کیا تاکہ ان لوگوں کے حالات کی تحقیق کریں جن کے ذریعہ سے بعد کی نسلوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پہنچی تھیں' اور فقہاء نے قانونِ شہادت میں یہ اصول قائم کیا کہ کسی ایسے معاملہ میں جس سے کوئی شرعی حکم ثابت ہوتا ہو' یا کسی انسان پر کوئی حق عائد ہوتا ہو' فاسق کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔ البتہ اس امر پر اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ عام دنیوی معاملات میں ہر خبر کی تحقیق اور خبر لانے

والے کے لائقِ اعتماد ہونے کا اطمینان کرنا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ آیت میں لفظ نباء استعمال ہوا جس کا اطلاق ہر خبر پر نہیں ہوتا بلکہ اہمیت رکھنے والی خبر پر ہوتا ہے۔ اسی لیے فقہا کہتے ہیں کہ عام معاملات میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ کسی کے ہاں جاتے ہیں اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اندر سے کوئی آکر کہتا ہے کہ آجاؤ۔ آپ اس کے کہنے پر اندر جاسکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ صاحبِ خانہ کی طرف سے اِذن کی اطلاع دینے والا فاسق ہو یا صالح۔ اسی طرح اہلِ علم کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جن لوگوں کا فسق جھوٹ اور بدکرداری کی نوعیت کا نہ ہو' بلکہ فسادِ عقیدہ کی بنا پر وہ فاسق قرار پاتے ہوں' ان کی شہادت بھی قبول کی جاسکتی ہے اور روایت بھی۔ محض ان کے عقیدے کی خرابی ان کی شہادت یا روایت قبول کرنے میں مانع نہیں ہے۔

بقیہ: قرآن کی بعض صفات

اور سورہ انعام میں فرمایا:

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ○ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ (۶: ۱۱۵ - ۱۱۶)

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم ڈھونڈوں درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری مفصل اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے حق کے ساتھ تو تم شک میں پڑنے والوں میں سے نہ ہو جیئو۔ اور تمہارے رب کی بات پوری ہوئی' ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ' کوئی نہیں جو ان باتوں کو بدل سکے۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہاں گفتگو حلال و حرام کے اس ضابطے کی ہورہی ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور جس کے خلاف مخالفین خوب پروپیگنڈہ کررہے تھے اور مومنین میں سے بعض اس سے متاثر ہورہے تھے۔ فرمایا:

خدا کا قانون سچائی اور عدل و انصاف کے لحاظ سے مکمل ہے۔ اس کے سوا حلال و حرام کا قانون بنانے کا کسی کو اختیار نہیں۔ بس تم لوگ بغیر کسی کھٹک کے خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو کھاؤ اور شک اور اضطراب میں نہ پڑو۔

قرآن کی بعض صفات

نعیم الدین اصلاحی

(قسط ۱)

قرآن کیا ہے ؟ یہ سوال سامنے آتے ہی ذہن میں کچھ اور سوالات ابھرتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہم کو بے جان مادے سے کس نے پیدا کیا ؟ پیٹ کے تین اندھیروں کے بیچ میں کس نے ماں کے خون کو غذا کی شکل میں بدلا ؟ کس نے ان تہ بہ تہ پردوں کے اندر ہوا پہنچائی ؟ کون ہے جو دنیا میں آنے سے پہلے ماں کی چھاتی میں دودھ اتارتا ہے ؟ کون ہے جو ماں باپ اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں محبت بھرتا ہے ؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو گوشت کے لوتھڑے کو کون اٹھاتا ؟ کس نے ماں کے دل میں ہمارے لیے محبت بھر دی کہ نو ماہ تک وہ ہمیں پیٹ میں لیے پھری ؟ پھر جان پر کھیل کر ہمیں جنم دیا اور اپنے تمام آرام و آرائش کو تج کر دو سال تک اپنی گود میں لیے پھری اور اپنے سینے سے چمٹائے رکھا ؟ پھر یہ زمین و آسمان کس لیے سرگرم عمل ہیں ؟ چاند اتنی باقاعدگی کے ساتھ اپنی ٹھنڈی روشنی کیوں بکھیرتا ہے ؟ یہ سورج اپنی سرگرمیوں کے ساتھ کیوں نکلتا اور ڈوبتا ہے ؟ یہ ستارے آسمانی دریا میں کیوں تیرتے ہیں ؟ یہ سمندروں کا پانی بھاپ کی شکل میں کس کے حکم سے تبدیل ہوتا ہے ؟ پھر یہ بادلوں کی شکل کیوں اختیار کرتا ہے ؟ یہ ہوائیں بادلوں کو اپنے کاندھے پر اٹھائے کیوں فضا میں پھرتی ہیں ؟ یہ زمین اپنے تمام خزانے کس لیے اگلتی ہے ؟ یہ ہماری سوکھی کھیتیوں پر بادلوں کے ذریعہ امرت کون برساتا ہے ؟

کیا یہ سب ہمارے اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے نہیں ہو رہا ہے اور کیا یہ سب بکھری ہوئی ان گنت نشانیاں اس بات کی گواہی نہیں دیتیں کہ خدا اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے' پھر اگر مہربان ہے جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے ----- تو پھر اس معاملے پر غور کیجیے کہ انسانی ڈھانچے کو برقرار رکھنے کے لیے تو اس نے اتنا اہتمام کیا' تو کیا اس حقیقی انسان کو باقی رکھنے کے لیے' جو اس جسمانی خول کے اندر ہے 'کوئی انتظام نہیں کرے گا ؟ نہیں' یہ اس کی رحمت کے خلاف ہے۔ وہ

انسانی زندگی کو یوں ہی بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ دے گا۔ اس نے روحانیت کی کھیتی کو سیراب کرنے کے لیے ضرور کوئی انتظام کیا ہوگا۔ اسی انتظام کا نام قرآن ہے جو براہِ راست اس کی رحمت کا تقاضا ہے۔ فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (سورۃ الرحمٰن ۵۵: ۱-۴)

رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی' اسی نے انسان کو وجود بخشا' پھر اس کو قوت گویائی عطا کی۔

قرآن کا معنی اور اس کے تقاضے

قرآن کے معنی ہیں بار بار پڑھنا' کثرت سے پڑھنا اور اس کتاب کا نام قرآن رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ پھر پڑھنا بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ آدمی چپ چاپ پڑھے' تو ظاہر ہے کہ اس کا فائدہ بھی اپنے ہی کو پہنچتا ہے۔ دوسرا پڑھنا یہ ہے کہ دوسروں کو سنائے۔ قرآن میں پڑھنا دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی خود بھی پڑھے اور سمجھے اور دوسروں کو بھی پڑھ کر سنائے اور اس کے معنی سمجھائے۔ بلکہ قرآن میں پڑھنے کا لفظ زیادہ تر دوسرے معنی ہی میں استعمال ہوا ہے لہٰذا جو لوگ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں ان کی اولین ذمہ داری ہے کہ قرآنِ مجید کو غور و فکر کے ساتھ پڑھیں' سمجھیں اور دوسروں کو بھی سمجھائیں' اس کی تعلیمات کی طرف بلائیں اور جو لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں انہیں دنیا اور آخرت کی کامیابی کی خوشخبری سنائیں اور جو لوگ اس کتاب سے بھاگیں' اعراض کریں' انہیں دنیا اور آخرت کی تباہی اور بربادی کے خطرے سے آگاہ کریں۔

قرآنِ مجید جہاں پر اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسے خود پڑھیں اور اس کے معنی و مطلب کو سمجھیں وہیں انہیں اس بات کی تاکید بھی کرتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ پڑھا' سمجھا اور سیکھا ہے اسے دوسروں تک پہنچائیں اسے پڑھ کر سنائیں اس کا مطلب سمجھائیں' اپنی زبان سے بھی سمجھائیں اور اپنی پاکیزہ زندگی' صاف ستھرے اخلاق اور عمدہ سیرت و کردار کے ذریعہ بھی اس کتاب کے قرآن ہونے کی گواہی دیں۔

یہ ذمہ داری صرف صحابہ کرامؓ ہی کی نہیں تھی بلکہ ان تمام لوگوں کی بھی ہے جن تک یہ کتاب پہنچے۔ سورہ یوسف کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (سورۃ یوسف ۱۲: ۱۰۸)

تم میری بات سنو' مانو یا نہ مانو' میرا راستہ یہی ہے۔ اسی توحید کے راستے پر ہمیں چلنا

ہے۔ میں اور میری پیروی کرنے والے پوری بصیرت اور روشنی میں دعوت حق دیتے رہیں گے۔

سورۃ انعام آیت ۱۹ میں نبیؐ کی زبان سے یہ اعلان کروایا گیا ہے :

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ

یہ قرآن وحی کے ذریعہ سے میرے پاس آیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ تم کو صاف صاف آگاہ کروں اس خطرے سے جس کی زد میں تم انکار کی وجہ سے آگئے۔ میں بھی تمھیں آگاہ کروں اور وہ لوگ بھی جن تک یہ قرآن پہنچے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم یہ ہوا کہ قرآن کی دعوت و تبلیغ ان تمام لوگوں پر فرض ہے جن تک وہ پہنچے اور جو اس کا اتباع کریں۔ ایک اور جگہ یہ الفاظ آتے ہیں :

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (النمل ۲۷ : ۹۲)

یعنی میرے رب نے مجھے صرف اپنی بندگی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اس بات کا بھی حکم دیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت کروں۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا لفظ یہاں پر "لوگوں کو سنانے" یعنی دعوت و تبلیغ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پھر سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ قرآن کی تبلیغ کی فرضیت ساری امت پر ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے جو سورہ قصص کے آخر میں آئی ہیں۔ شروع میں تو خطاب صرف پیغمبرؐ سے ہے لیکن بات ختم ہوتے ہوئے تمام مومنین کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ یُّلْقٰٓی اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ ۞ وَلَا یَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَیْكَ وَادْعُ اِلٰی رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۞ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۞ (قصص ۲۸ : ۸۵ ـ ۸۸)

بے شک جس نے تم پر قرآن کی ذمہ داری ڈالی ہے وہ تمھیں ایک اچھے انجام تک ضرور پہنچا کے رہے گا۔ کہہ دو کہ میرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔

تم تو متوقع نہ تھے کہ تم پر کتاب اتاری جائے یہ تو بس تمہارے رب کا فضل ہوا ہے اور تم ان کافروں کے پشت پناہ نہ بنو اور یہ تم کو اللہ کی آیات سے روکنے نہ پائیں جبکہ

وہ تمہاری طرف اتاری جاچکی ہیں۔ اور تم اپنے رب کی دعوت دو اور مشرکوں میں سے نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ فیصلہ صرف اسی کے اختیار میں ہے۔ اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

ان آیات میں حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ذریعہ تمام لوگوں سے کہا جارہا ہے کہ تم لوگ اپنا فرض انجام دو، باطل پرستوں کی قوت وشوکت کی وجہ سے یہ کام بند نہ کرو، نہ اس میں کنٹریبونٹ کردو، بغیر کسی مداخلت کے یہ کام جاری رہنا چاہیے اور خدا پر بھروسہ کرو، وہ دائمی سہارا ہے۔ اسے فنا اور زوال نہیں۔ یہ قرآن تو کامیابی کی کنجی ہے۔ اسے اس لیے تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا گیا کہ تمہارے حصہ میں نحوست و ناکامی آئے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (طٰہٰ ۲۰: ۲)

اور ایک دوسری جگہ فرمایا ہے :

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (بنی اسرائیل ۱۷: ۹)

یعنی یہ کتاب ---- قرآن ---- زندگی گزارنے کے ایسے اصول اور قوانین بتاتی ہے جو نہایت موزوں ہیں۔ یہ کتاب ایسا جامہ فراہم کرتی ہے جو انسانیت کے جسم پر پوری طرح فٹ آتا ہے، انسانیت کی نشوونما اور ترقی کی راہ میں یہ اصول قطعاً" رکاوٹ نہیں ڈالتے پھر اسی سورہ میں آگے چل کر وہ اصول زندگی اور ضابطۂ حیات بتائے گئے ہیں جو سارے انسانوں کے لیے ہر زمانے میں نہایت مناسب رہے ہیں۔ پھر انہی اصولوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار ساتھیوں نے ایک مضبوط، منظم اور نہایت ترقی یافتہ سلطنت چلا کر انسانوں پر حجت تمام کردی۔

اب جو لوگ اُس کتاب پر ایمانِ کامل رکھتے ہیں اور وہ اپنے دعوے میں سچے بھی ہیں ان پر فرض ہے کہ قرآن کے اصولوں کے علاوہ دوسرے تمام گھڑے ہوئے اصولوں کا انکار کریں اگر وہ قرآن کو خدائی دستور مانتے ہیں تو شرافت اور دیانت کا یہ تقاضا ہے کہ باطل نظام کو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں سے غذا نہ پہنچائیں۔ اگر انہیں ذرہ برابر بھی علم ہو اور خوف خدا ہو تو ان کا فرض ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی ایسا دستور نہ چلائیں جو خدا اور اس کے رسول کی ہدایت سے بے نیاز اور کتاب و سنت کو نظرانداز کرکے بنایا گیا ہو۔

قرآن مجید میں ایک جگہ اس مقدمے کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو حضورؐ قیامت کے دن خدا کی عدالت میں دائر کریں گے، "اے میرے رب ان لوگوں کے اندر تو نے مجھے قرآنِ پاک دیکر بھیجا

تھا۔ انہوں نے اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جیسا کوئی شخص گری پڑی ردی چیز کے ساتھ کرتا ہے۔"

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ (سورۃ الفرقان ۲۵ : ۳۰)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ابن کثیرؒ فرماتے ہیں :

و ذالک ان المشرکین کانوا لا یصغون للقران ولا یستمعونہ کما قال تعالی "وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القران والغوا فیہ" الایۃ فکانوا اذا یتلی علیھم القران اکثروا اللغط والکلام فی غیرہ حتی لا یسمعونہ فھذا من ھجرانہ وترک تدبرہ وتفھمہ من ھجرانہ وترک العمل بہ وترک تصدیقہ من ھجرانہ وامتثال اوامرہ واجتناب زواجرہ من ھجرانہ والعدول عنہ الی غیرہ من شعر او قول اوغناء اولھو او کلام او طریقۃ ماخوذۃ من غیرہ من ھجرانہ۔

مشرکین کی طرف سے قرآن کا چھوڑنا یہ تھا کہ ان کے سامنے جب قرآن کا پیغام پیش کیا جاتا ہو تو شور و ہنگامہ مچاتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور کسی طرح بھی سننے کے روادار نہ تھے (لیکن قرآن مجید کا چھوڑنا صرف اسی قدر نہیں) بلکہ قرآن کا چھوڑنا یہ بھی ہے کہ اس پر ایمان نہ لایا جائے اور اس کی تصدیق نہ کی جائے اور اس پر غور و فکر نہ کیا جائے' اس پر عمل نہ ہو' اس کے احکام کی پیروی نہ ہو' جن چیزوں سے اس نے روکا ہے ان سے بچنے کی کوشش نہ کی جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کو نظر انداز کرکے شعر و شاعری' لوگوں کے خیالات' گیت' گانے' بیہودہ باتیں اور لہو ولعب اور اس طریقہ زندگی کی پیروی کی جائے جو اسے نظرانداز کر کے بنایا گیا ہو۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳)

اسی طرح سورۃ مائدہ میں فرمایا۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ (۵ : ۵۰)

اگر یہ خدا کے قانون سے روگردانی کرتے ہیں تو پھر کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں ؟ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

اس آیت کی تفسیر علامہ ابن کثیرؒ نے اس طرح فرمائی ہے :

ینکر تعالیٰ علی من خرج عن حکم اللہ المحکم المشتمل علی کل خیر والناھی عن کل شروعدل الی ما سواہ من الاراء والاھواء والاصطلاحات التی وضعھا الرجال بلا سند من شریعتہ اللہ کما کان اھل الجاھلیتہ یحکمون بہ من الضلالات والجھالات مما یضعون باراتھم واھوائھم وکما یحکم التتار من السیاسات الملکیتہ الماخوذۃ عن ملکھم "چنگیز" الذی وضع لھم "الیاسق" وھوعبادۃ عن کتاب مجموع من احکام وقد اقتبسط من شرائع شتی من الیھودیتہ والنصرانیتہ والملتہ الاسلامیہ وغیرھا وفیھا کثیر من الاحکام اخذھا من مجرد نظرہ وھواہ فصار فی نبیہ شرعا - ویعد قولہ علی الحکم بکتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فمن فعل ذالک منھم فھو کافر یجب علیہ قتالہ حتی یرجع الی حکم اللہ ورسولہ فلا یحکم سواہ فی قلیل ولا کثیر (ابن کثیر ج ۲، مکتبہ الریاض الحدیثہ)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر اظہارِ نکیر کرتا ہے جو اس کتابِ ہدایت سے روگردانی کرکے انسان کے خود ساختہ نظریات و خیالات اور ان اصطلاحات کی آغوش میں چلے جائیں جن کی کتاب و سنت میں کوئی سند نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کتابِ ہدایت خود تمام بھلائیوں کا خزانہ ہے اور انسانوں کو تمام برائیوں سے روکتی ہے۔

دورِ جاہلیت کے لوگوں کا یہی حال تھا کہ وہ ان جاہلیتوں اور گمراہیوں کے پیرو تھے جن کو انہوں نے اپنے جی سے گھڑ رکھا تھا۔ اور لگ بھگ یہی حال تاتاریوں کا بھی تھا کہ انہوں نے اپنی سلطنت کا نظامِ سیاست اپنے بادشاہ "چنگیز خان" کے اس دستور سے اخذ کیا تھا جس کو "یاسق" نے ان کے لیے وضع کیا تھا جو حقیقت میں یہودی، نصرانی اور اسلامی وغیرہ قوانین سے ماخوذ ایک مجموعۂ قانون تھا (گویا کہ وہ اس زمانے کا ایک سیکولر نظامِ زندگی تھا۔ نعیم) اور اس کے بیشتر احکام اس کے اپنے ذہن و فکر کی پیداوار تھے۔ یہ قانونِ زندگی اس قوم کے تمام ہی افراد کے نزدیک واجب العمل تھے اور ان کو قرآن و سنت پر بالاتری حاصل تھی۔ پس ان میں سے جو لوگ بھی یہ حرکت کریں ان سے قتال واجب ہے۔ یہاں تک کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی طرف رجوع کریں اور ان دونوں کے علاوہ کسی بھی دستور اور نظامِ زندگی کو اپنے چھوٹے بڑے معاملات میں حکم نہ بنائیں۔

بقیہ بر صفحہ ۳۱

مولانا سیّد احمد عروج قادری مرحوم

(ایک شناسا کے تاثرات)

سیّد معین الدین احمد قادری

(قسط ۱)

موت ابنِ آدمؑ کی میراث ہے اور دردِ اجل لادوا ہے۔ "اجلِ مسمّٰی" کسی کی بھی نہ ٹلی ہے نہ ٹلے گی۔ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن یقیناً مرنا ہے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے ؎

یہ سقفِ کہن ہے ابھی تک نئی
اسے دیکھتے یونہی دنیا گئی
(اسماعیل میرٹھی مرحوم)

با ایں ہمہ ایک عالم کی موت کو ایک جہان کی موت قرار دیا گیا ہے۔ مولانا عروج قادری مرحوم، مدیر "زندگیٔ نو" رام پور، یوپی کا سانحۂ ارتحال بھی دینی اور علمی حلقوں کے لیے اور تحریک اسلامی کے تعلق سے ایک محسوس اور عظیم حادثہ ہے اور ان کے خاندان، قدردانوں، احباب، نیاز مندوں، شاگردوں اور شناساؤں کے لیے غم انگیز اور پر آزمائش ابتلاء۔ **اللھم افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا!**

مولانا کی وفات نے جماعتِ اسلامی ہی نہیں، برصغیر کے علماء اور دینی حلقوں کی صفوں سے ایک با وزن اور مایہ الاستناد شخصیت کی جگہ خالی کر دی اور یہ معمولی خسارہ نہیں۔ یہ ایک ایسا خسارہ ہے جس کی تلافی اس عہدِ قحط الرجال میں آسان نظر نہیں آتی، **والعلم عنداللہ**۔ جس قادرِ مطلق، مدبّرِ کائنات، زندۂ جاوید ہستی نے ایک طویل مدت تک ایک مومنِ مخلص سے اپنے دین کی خدمت لی اور توفیقِ ارزانی فرمائی، وہ تو بہرحال ہر "مافات" کی تلافی پر قدرت رکھتا ہے، **وما ذالک علی اللہ بعزیز**۔

ثقہ اور مستند عالم

مولانا مرحوم ایک ثقہ اور مستند عالم، علوم القرآن کے ماخذ و مصادر پر وسیع نگاہ رکھنے والے، صاحبِ قلم اور مصنف تھے۔ علمی اور فقہی تجزیہ و تنقید پر انہیں پر اعتماد قدرت حاصل تھی۔ انہیں قلمی دیانت کا بڑا اہتمام تھا۔ وہ ایک ایسے صاحبِ فضل و کمال تھے جس نے حق اور حقیقت کے معاملے میں کبھی لومتہ لائم کی پرواہ نہیں کی۔ شہرت و ناموری، قبولِ عام و عوام کے نقصان اور ابتلاء و آزمائش سے اندیشہ ناک ہوئے بغیر ایمانی صلابت کے ساتھ وہ حق گوئی پر اصرار کرتے رہے۔

امتیازی پہلو

ان کی شخصیت کے دو پہلو، میرے خیال میں، ان کے رفقاء، شناساؤں اور ان تمام لوگوں پر واضح تھے جنہیں ان سے کبھی واسطہ پڑا ہو۔ ایک پہلو تھا سادگی، نرمی، فروتنی اور غیر معمولی انکسار اور خدمتِ دین کے سلسلے میں راحت اور عافیت کوشی سے "قلندرانہ" بے نیازی۔ ان کی شخصیت کا دوسرا نمایاں پہلو تھا حق گوئی اور بے باکی میں یگانوں اور بیگانوں کی تفریق کیے بغیر فولاد منش کردار۔ وہ ناحق اور ناسزا کے لیے شمشیرِ بے نیام تھے۔

دولت و ثروت کا بھی پندار ہوتا ہے، فضل و کمال کا بھی۔ عام طور پر اہلِ علم اور اصحابِ قلم کی تحریریں "انا" کی نمود سے پاک نہیں ہوتیں۔ یہ ایک فطری کمزوری ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کے عہد میں تو مصنف ہمیشہ جمع متکلم (ہم) اور قاری واحد حاضر (تم) کے صیغے میں ہوا کرتا تھا اور آج بھی مستثنیات کو چھوڑ کر بیشتر اہلِ قلم ایسے ہیں جن کی تحریریں اور تصانیف "نمودِ ذات" سے خالی نہیں ہوتیں۔ مولانا مرحوم اپنی تحریروں میں موضوعِ زیرِ بحث کی بجائے اپنی ذات یا اپنے علمی قد و قامت یا اپنے خانوادے کی روحانی عظمت و منزلت کو نمایاں کرنے کی "پرکاہ" سعی کرتے نظر نہیں آتے، حالانکہ کسی درجے میں یہ کمزوری انہیں ہوتی تو کوئی عجیب بات نہ تھی کہ بہرحال ان کا تعلق بھی ایک قدیم خانوادۂ رشد و ہدایت سے تھا اور انہوں نے فضائے خانقاہ میں اور مسندِ ارشاد کے زیرِ سایہ آنکھ کھولی تھی اور تعلیم و تربیت پائی تھی۔ جہاں عقیدت اور نیاز مندی کی فراوانی ہو، احساسِ ذات کا سر اٹھانا تقریباً ناگزیر ہوتا ہے۔

ان کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں سے متعلق بے شمار اندرونی شہادتیں خود ان کی تحریروں سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے رفقاء کے ذاتی تجربات بھی ہوں گے۔

میں نے ایک مضمون اشاعت کے لیے بھیجا۔ اس کے مطالعے سے معلوم نہیں کیوں اور

کیسے ان کے ذہن میں یہ بات داخل ہوگئی کہ میں "ڈاکٹر" ہوں۔ انہوں نے مضمون کی رسید بھیجی تو پتہ میں میرے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" کا اضافہ تھا۔ میں نے لکھا "مولانا! میں نہ معالج ہوں نہ طبیب (نئے اطباء ڈاکٹر کہلائے جانے پر اصرار کرتے ہیں) نہ ایلوپیتھ ڈاکٹر' نہ کسی تحقیقی کارنامے کی بنیاد پر پی ایچ ڈی کی سند رکھتا ہوں۔ عوامی زندگی اور سیاست میں بھی میرا کوئی مقام نہیں کہ اعزازی ڈاکٹریٹ مل گئی ہوتی۔ اس اضافے سے میری شناخت مشتبہ ہوگئی۔"

مولاناؒ نے جواب میں تحریر فرمایا "اس غلطی میں میرے قصد و ارادہ کا کوئی دخل نہیں۔ شاید یہ غلطی اس لیے ہوئی کہ آپ کو اپنا تعارف کرانا پڑا اور اب یہ حقیر آپ سے کچھ زیادہ واقف ہوگیا۔ میری غلطی کو معاف کردیجیے اور اپنے مضامین بھیجتے رہیے' آئندہ آپ کے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لگے گا"۔

ظاہر ہے اس قسم کی فروگذاشت رسائل و جرائد کی اشاعتوں میں ہو جایا کرتی ہے اور بعد کی اشاعت میں اس کی اصلاح زیادہ سے زیادہ معمول کی رسمی معذرت سے کر دی جاتی ہے ۔ میرا مقصد محض ایک غیر ارادی غلطی کی اصلاح ہی تھا لیکن مولانا کے انداز معذرت سے میں بہت متاثر اور نادم ہوا اور سوچنے لگا کہ کاش یہ "حادثہ" نہ پیش آیا ہوتا۔

مولانا کی شخصیت کے دوسرے پہلو کی توثیق ان کے قریبی رفقاء کے تجربے اور مشاہدے کے علاوہ ان کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے جو تبصرے' تنقید' استفسارات کے جوابات اور خود ان کی اپنی تصانیف اور "زندگیٔ نو" کے اشارات کی شکل میں سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند مثالیں ان کی ایک پیش نظر تصنیف سے پیش کی جاتی ہیں۔

"تصوف کی تین اہم کتابیں" ـــــ حضرت علی بن عثمان ہجویری لاہوری (م ۴۶۵ھ) کی تصنیف کشف المحجوب' حضرت نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ (م ۷۲۰ھ) کے ملفوظات فوائد الفواد اور حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمتہ اللہ علیہ (م ۱۰۳۴ھ) کے مکتوبات ـــــ عنوان ہے کتاب و سنت کی روشنی میں ان تین کتابوں کے گہرے اور غیر جانب دارانہ مطالعے کا جو بقول مصنف اور فی الواقع ہندوستان اور پاکستان میں بکثرت پڑھی جاتی ہیں۔

پیش لفظ میں تحریر کرتے ہیں: "ہمارے مسلم معاشرے میں بزرگان دین کی عقیدت میں غلو کے جو مظاہر پھیلے ہوئے ہیں ان کا ایک بڑا ماخذ تصوف کی کتابیں ہیں۔ اس کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان کتابوں کو اس طرح سامنے لایا جائے کہ ان میں جو باتیں کتاب و سنت یا عقل و نقل کے مطابق ہوں وہ بھی نمایاں کی جائیں اور جو باتیں عقل و نقل کے خلاف ہوں وہ

بھی واضح کی جائیں۔ اس حقیر کا احساس ہے کہ یہ بھی غلوئے عقیدت ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ کام اب تک یا تو کیا ہی نہیں گیا یا بہت کم کیا گیا ہے۔" مولانا کے پیش نظران تصانیف پر کوئی سیر حاصل بحث یا تفصیلی تبصرہ نہ تھا۔ اس بات کی انہوں نے صراحت کی ہے۔ صرف نمونے کے طور پر غلوئے عقیدت اور مطلقاً انکارِ تصوف کی دو انتہاؤں کے یک رخے پن کی نشاندہی کردی ہے اور ان کتابوں میں جو غلط چیزیں مخلوط ہوگئی ہیں ان کو صحیح چیزوں سے انہوں نے الگ کردیا ہے۔

پروفیسر خلیق نظامی تصوف کے لٹریچر پر حوالہ جاتی درجہ استناد اور شہرت رکھتے ہیں۔ مولانا نے ان پر بھی بلا رو رعایت سخت گرفت کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

پروفیسر خلیق نظامی نے تاریخ مشائخِ چشت کے مقدمے میں لکھا ہے "تصوف کی مستند کتابوں مثلاً قوت القلوب، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف، تذکرۃ الاولیاء، فوائد الفواد، خیر المجالس کے صفحے کے صفحے الٹ جایئے صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً کتاب و سنت کی تلقین ملے گی" (ص ۲)

پروفیسر خلیق نظامی کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد مولانا نے اپنے پیش لفظ میں لکھا "جن صاحبانِ علم نے ان کتابوں کا خود مطالعہ نہیں کیا وہ پروفیسر صاحب کی تاریخ دانی پر اعتماد کرکے ان کے دعوے کو صحیح مان لیں گے 'حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ان کتابوں کے صفحے کے صفحے عقلِ عام اور کتاب و سنت کے خلاف بھی موجود ہیں"۔ بہرحال انہوں نے ان تین کتابوں کی حد تک، یہ بات اقتباسات کے ذریعے ثابت کردی ہے۔ ساتھ ہی کتاب و سنت کے حوالے سے ہی تین بزرگ مرجعِ عقیدت عام صوفیاء کی تصریحات کا اختلاف ثابت کردیا ہے۔

۱۔ کشف المحجوب

زمانی ترتیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے کشف المحجوب سے ابتداء کی گئی ہے۔

کتاب اور مصنف کے تعارف کے ضمن میں، کسی کتاب کے تعارف کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تعارف یا ترجمہ یا تلخیص میں ان باتوں کو نظر انداز کرنا جو دینی مسلّمات کے خلاف ہیں، یا کتاب و سنت کی تعلیمات ان کا ساتھ نہیں دیتیں یا ان کی ایسی تاویلیں کرنا جو عقل و نقل سے متصادم ہوں، صحیح نہیں ہے۔ زمانۂ حال میں بزرگانِ دین کے جو سوانح حیات مرتب کیے جا رہے ہیں، یا ان کی کتابوں کے جو ترجمے یا تلخیص شائع کی جا رہی ہیں، ان میں

غلطیوں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے اور ان کتابوں کے قابلِ تنقید حصے حذف کردیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ مفید نہیں ہے کیونکہ لوگ ان اصل کتابوں کو پڑھتے ہیں اور غلط باتوں کو بھی صحیح سمجھ لیتے ہیں اور ان کتابوں کی وجہ سے عوام و خواص میں جو غلط چیزیں پھیلی ہوئی ہیں ان کی اصلاح نہیں ہوتی۔"

تعارف کے بعد کتاب کے مختلف مندرجات پر گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں مختصر تبصرہ ہے جو مولانا کے مسلکِ تبصرہ و تنقید' کے ضمن میں سلامت روی' توازن اور تصنیف و مصنف کے ساتھ عدل و قسط کی پوری رعایت ملحوظ رکھنے کے علاوہ حق گوئی و بے باکی 'گرفت اور نکیر کے معاملے میں یہ شہادت بھی فراہم کرتا ہے کہ وہ حق اور حقیقت کے معاملے میں بلند مقامی اور "ہالۂ تقدس" سے بھی متاثر نہیں ہوتے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ خود ایک خانوادۂ ارشاد سے تعلق رکھتے تھے اور ان بزرگوں اور بالخصوص اہلِ تصوف سے عقیدت ہی کی فضا میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی۔

مولانا نے اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ ان تینوں کتابوں میں کتاب و سنت کے مطابق جو تصریحات ہیں ان کی جانب بھی مختصر اشارہ کردیں تاکہ ان کا اپنا تعارف اور تبصرہ یک رخا نہ رہ جائے۔ چنانچہ کشف میں ملحدوں کی جو تردید کی گئی ہے اس کا تحسین آمیز انداز میں انہوں نے ذکر کیا ہے ' لکھتے ہیں کہ پانچویں کشف میں جو نماز کے بیان میں ہے ' محبت اور عشق پر لمبی گفتگو کی گئی ہے ۔اس بحث میں انہوں نے ملحدوں کی تردید کی ہے اور سہل بن عبداللہ تستری کا محبت کے بارے میں یہ جملہ نقل کیا ہے :المحبتہ ' معانقۃ الطاعات و مباینۃ المخالفات" اللہ کی طاعتوں کو گلے لگانا اور اللہ کی مخالفتوں سے الگ ہوجانے کو محبت کہتے ہیں"۔ بعد ازاں شیخ ہجویریؒ کی فارسی عبارت کا ترجمہ درج کرنے کے بعد مولانا نے تحریر کیا "یہ کتنی صحیح اور ایمان افروز بات ہے"۔ عبارت یہ ہے :

"اور سہل بن عبداللہ نے یہ بات ملحدوں کے اس قول کے رد میں کہی ہے کہ بندہ اللہ کی محبت میں اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ طاعت کا مکلف باقی نہیں رہتا اور ان کا یہ قول خالص زندقہ ہے 'اس لیے کہ یہ بات محال ہے کہ صحتِ عقل کی حالت میں کسی بندے سے اس کے مکلف ہونے کا حکم ساقط ہو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کبھی منسوخ نہیں ہوگی' اور اگر کسی ایک عاقل بالغ سے شریعت کے احکام کا ساقط ہونا جائز ہو تو تمام عاقل بالغ لوگوں سے اس کا ساقط ہونا جائز ہوگا اور یہ خالص زندیقیت (بے دینی) ہے' البتہ پاگلوں کے احکام اور ہیں۔"

کشف کے مندرجات کے مثبت پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد تبصرے میں اس کے منفی پہلوؤں پر کلام کرتے ہوئے مولانا کی حق گوئی' شمشیرِ بے زنہار بن کر سامنے آتی ہے۔ شیخ ہجویری نے سورۂ ذاریات کے آخری رکوع کی آیت **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** پر ای **ليعرفون** کا اضافہ کرکے مقصدِ زندگی ہی بدل دیا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے تحریر کیا ہے:

"**ليعرفون** (یعنی تاکہ مجھے پہچانیں) کا اضافہ کرکے اور "عبادت و بندگی" کو ترجمہ سے ختم کرکے انسان کی زندگی کا مقصد ہی بدل دیا گیا ہے۔

عبادت کی یہ تفسیر اور اس کا یہ ترجمہ (بذریعہ اضافۂ لفظی) نہ عربی لغت کے لحاظ سے صحیح ہے نہ قرآن و احادیث کے استعمالات کے لحاظ سے صحیح ہے۔ بات یہ ہے کہ صوفیہ اپنی زندگی کا مقصد بدل چکے تھے لیکن ضرورت تھی کہ اس کو اسلامی ثابت کیا جائے۔ اس لیے آیاتِ قرآنی کی من مانی تاویل کیے بغیر چارہ نہ تھا۔"

شیخ ہجویری نے اولیاء کی اقسام اور ان کی تعداد لکھنے کے بعد فرمایا "اس پر روایتیں ناطق اور اس کی صحت پر اہلِ سنت متفق ہیں"۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے لکھا "اس قسم کے غلط دعوے اور قرآن و احادیث پر صوفیہ کی یہ زیادتی دیکھ کر دل سے ان کے لیے دعائے مغفرت نکلتی ہے"۔

اولیاء کا مخصوص طبقہ

تبصرے میں "اولیاء کا مخصوص طبقہ" کے عنوان کے تحت چند اقتباسات نقل کیے گئے ہیں جن میں سے کسی میں کہا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اولیاء کو دوستی اور ولایت کے ساتھ خاص کیا ہے "وہ ملک کے والی ہیں جنہیں اس نے منتخب کیا ہے اور اپنے فعل کے اظہار کا نشانہ بنایا ہے" کسی میں یہ کہ "آسمان سے پانی ان کے قدموں کی برکت سے برستا ہے اور زمین سے نباتات' ان کے احوال کی صفائی سے اگتے ہیں اور مسلمانوں نے کافروں پر فتح انہی کی ہمت سے پائی ہے" اور کسی میں یہ کہ "خداوند تعالیٰ کے اولیاء' ملک کے مدبر ہیں اور عالم کے نگران' اور خداوند تعالیٰ نے خاص طور پر ان کو عالم کا والی گردانا ہے اور عالم کا حل و عقد' اللہ نے ان کے ساتھ وابستہ کردیا ہے اور احکام عالم کو ان ہی کی ہمت کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔" قرآن' اللہ کے بارے میں کہتا ہے **يُدَبِّرُ الْاَمْرَ**' کائنات کا انتظام چلا رہا ہے۔ "جہانِ ہستی کے ساتھ اس کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ کبھی اس کو وجود میں لایا تھا بلکہ ہمہ وقت وہی اس کا مدبّر و منتظم ہے' اسی کے قائم

رکھنے سے یہ قائم ہے اور اسی کے چلانے سے یہ چل رہا ہے" ۔ وہ ملحدین یورپ کے خیال کے مطابق "Clock Maker God" نہیں ہے' اس کائنات میں بالفعل اس کی حکمرانی ہے (۱۰: ۳)۔ شیخ ہجویریؒ کا اور بالعموم تمام بزرگانِ دین کا احترام ملحوظ رکھنے کے باوجود نصِ صریح کے خلاف شیخؒ موصوف کے موقف پر مولانا اپنی برہمی ضبط نہ کرسکے' ان کی صلابتِ ایمانی اس انحراف کو ہرچند کہ وہ ایک مرجع خلائق بزرگ سے ہوا تھا کیونکر برداشت کرسکتی تھی۔ اس مقابلے میں ادنیٰ مداھنت کتاب و سنت کی پاسداری کے بھی منافی تھی اور ان کی افتادِ طبع کے بھی۔

مولانا نے مذکورہ بالا اقتباسات پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے تحریر کیا: "قرآن کہتا ہے کہ مشرکینِ عرب' اللہ ہی کو اپنے ملک کا مدبّر سمجھتے اور مانتے تھے کسی اور کو نہیں۔ فلسفیانہ تصوف کہتا ہے کہ اولیاء سلطنتِ الٰہی کے مدبر ہیں اور عالم کا حل و عقد' اللہ نے انہیں کے حوالے کردیا ہے۔ استغفراللہ واعوذ باللہ لاحول ولا قوۃ الاباللہ العلی العظیم"۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ برہمی کے باوجود ناپختہ اور خام ناقدینِ تصوف کی مانند نہ طنز ہے نہ استخفاف۔ یہ مولانا کے کردار کا امتیاز تھا کہ وہ اپنے موقف کی صحت' علمی انداز اور محکم استناد کے ساتھ پیش کرتے۔ نہ نمودِ ذات' نہ تعلی نہ استخفاف ۔ جبکہ برصغیر کے چوٹی کے بعض شہرۂ آفاق اور علمی اعتبار سے بلند قامت گنے جانے والے اہلِ علم کی تصانیف بھی ان کمزوریوں کی شہادت سے پاک نہیں ہیں۔

ضعیف اور موضوع احادیث

"ضعیف اور موضوع احادیث" کے عنوان کے ماتحت نمونے کے طور پر کشف سے کچھ احادیث نقل کی گئی ہیں جن کا سہارا شیخ ہجویری نے لیا ہے اور عام طور پر صوفیہ اپنے مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لیے لیتے ہیں۔

احادیث اور ان پر مولانا کا تبصرہ ایجاز و اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے ۔اختصار اور سہولت کے پیش نظر اصل فارسی عبارت کا ترجمہ ہی نقل کیا جاتا ہے :

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اہلِ تصوف کی آواز سنی پھر ان کی دعا پر آمین نہ کہی وہ اللہ کے نزدیک غافلوں میں لکھا جائے گا"۔ (کشف ص ۲۲)

تبصرہ: "اتنی واضح موضوع حدیث ابھی تک نہیں پڑھی تھی۔ خود اہلِ تصوف تسلیم کرتے ہیں کہ تصوف اور اہلِ تصوف کے الفاظ عہدِ صحابہؓ کے بعد مسلمانوں کے لٹریچر میں داخل ہوئے ۔ لیکن انہوں نے بلا تامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ حدیث منسوب کردی"۔

(۲) رسول علیہ السلام نے کہا "تم پر صوف پہننا لازم ہے ۔ اس سے اپنے دلوں میں ایمان کی

حلاوت پاؤ گے"۔

تبصرہ: "جن لوگوں نے اس طرح کی حدیثیں وضع کی ہیں۔ انہوں نے خدا کے دربار میں پیش کرنے کے لیے کوئی جواب سوچ لیا ہو گا لیکن جن لوگوں نے اس طرح کی حدیثیں اپنی کتابوں میں نقل کر کے انہیں پھیلایا وہ کم ذمّہ دار نہیں ہیں"۔

(۴) رسول صلی اللہ علیہ وسلم گفت: **اجیعوا بطونکم واظموا اکباد کم واعروا اجساد کم لعل قلوبکم تری اللہ عیا نافی الدنیا۔**

شکمہا را گرسنہ دارید و جگرہا را تشنہ دارید و تن ہارا برہنہ دارید تا مگر خداوند را بینید بدل در دنیا۔

تبصرہ: "فارسی ترجمہ شیخ ہجویریؒ کا ہے۔ اس طرح کی موضوع حدیث پڑھ کر غصہ کو ضبط کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جھوٹی حدیث پر جو وعید آئی ہے اس سے یہ لوگ کس قدر غافل ہو گئے تھے۔

صوفیہ صافیہ نے آیات کی من مانی تاویلات، ضعیف، موضوع احادیث، محیر العقول واقعات، مکاشفات و کرامات اور عجیب و غریب بیانات سے الماریاں بھر دی ہیں، حد یہ ہے کہ طویل تحریر لکھنے کے بعد آخیر میں اسی طرح کا (وعارف آنست کہ سخنش اندک بود، حیرتش مدام) جملہ لکھ دیتے ہیں۔ اب انسان حیران رہ جاتا ہے کہ لسانِ کلیل اور کلامِ قلیل کا یہ حال ہے تو اگر کہیں ان کی زبانیں کھل جاتیں تو کلام کا انداز کیا ہوتا"۔

مذکورہ بالا سخت گرفت اور شدید نکیر کے بعد تبصرے کے آخر میں یہ سطور مولانا کے توازنِ ذہنی، احتیاط پسندی اور اعتراف حقیقت سے انحراف نہ کرنے کی ان کی افتادِ طبع کا روشن ثبوت ہیں: "بہرحال صوفیائے کرام نے اپنی کتابوں میں جو باتیں کتاب و سنت کے مطابق لکھی ہیں اور اعمالِ صالحہ کی جو ترغیب دی ہے (کشف المحجوب کے مثبت پہلوؤں کے ذکر کے سلسلے میں کتاب و سنت سے مطابقت رکھنے والی تصریحات کا تذکرہ بھی تعارف کے ضمن میں انہوں نے کیا ہے)۔ اس پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین"

۲۔ فوائد الفواد

تعارف کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں "فوائد الفواد تصوف کی مشہور و معروف اور مستند کتاب ہے۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو ان کے بہت ہی مقرب مرید و خادم حضرت امیر حسن علا سجزی المعروف بہ حسن دہلوی رحمتہ اللہ نے

حضرت نظام الدین اولیاء سے خود سن کر مرتب کیا ہے ----- ان ملفوظات میں واقعات و حکایات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ اس کتاب کا ایک بڑا حصہ بن گئے ہیں"۔ کتاب کی وجہ تسمیہ خود مرتب نے یہ بیان کی ہے "ایں مجموعہ راچوں دلہائے درد منداں ازان فائدہ می گیرند فوائد الفواد نام کردہ شد"۔

اپنے تنقیدی مسلک کے مطابق اور ریکارڈ کو درست کرنے اور تصوف کے تعلق سے یک رخے اور انتہا پسندانہ موقف کی اصلاح کو قرینِ حقیقت بنانے کے لیے اس تصنیف کے بھی مطابق کتاب و سنت اور مخالفِ کتاب و سنت، عقل و نقل تصریحات کی بے لاگ لپٹ نشاندہی کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

فوائد الفواد کے دو امتیازات کا تذکرہ کرنے کے بعد مولانا نے مختلف عنوانات (عنوانات خود ان کے قائم کردہ ہیں) قائم کر کے ملفوظات کے مثبت پہلو کی نشاندہی کی ہے۔ امتیازات یہ ہیں:

(۱) اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں فلسفیانہ مباحث نہیں ہیں اور نہ اس میں وحدۃ الوجود کا کوئی دخل ہے۔ سیدھی سادی باتیں ہیں جو متعدد مواقع پر دل کو چھو لینے والی ہیں۔

(۲) حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے خود اپنے لیے کسی درجے اور مرتبے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ ہر جگہ تواضع کا اظہار فرمایا ہے۔

صومِ دہر کے عنوان کے تحت ملفوظات میں مسلسل روزہ رکھنے کے بجائے حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے ----- ایک دن روزہ رکھنے اور ایک دن افطار کرنے ----- کی تلقین کے بارے میں تحریر کرتے ہیں "یہ تشریح حدیثِ نبوی کے عین مطابق ہے"۔

اسمِ اعظم کے بارے میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ نے ابراہیم ادھم رحمتہ اللہ علیہ کا قول نقل فرمایا "معدہ کو لقمۂ حرام سے پاک رکھو اور دل کو دنیا کی محبت سے دور کرو۔ اس کے بعد تم اللہ تعالیٰ کے جس نام سے بھی اس کو پکارو گے وہی اسمِ اعظم ہے" (۹۷) اس پر تبصرہ ہے "یہ کتنی موثر نصیحت ہے۔ یہ ہے وہ تصوف جس کا کوئی مومنِ مخلص انکار نہیں کر سکتا۔"

مولانا حافظ سراج الدین بدایونی نے حضرت نظام الدین اولیاء سے دریافت کیا" **من لیس لہ شیخ فشیخہ شیطان**" کیا یہ حدیثِ رسولؐ ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا "یہ مشائخ کا قول ہے"۔ پھر سوال کیا "**من یر مفلحا لا یفلح ابدا**" اور یہ؟ حضرت شیخ نے فرمایا "یہ بھی مشائخ کا قول ہے"۔
تبصرہ: "شکر ہے کہ ایک بڑے درجے کے صوفی نے بھی ان دونوں اقوال کے حدیثِ رسولؐ ہونے

سے انکار کیا اور صحیح بات بتلا دی۔ پہلا قول نہ صرف یہ کہ حدیث نہیں ہے بلکہ بالکل غلط ہے"۔

قولِ باطل کی تردید

مرتب ملفوظات نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ سے اس قول کے بارے میں استفسار کیا، جو حضرت بایزید بسطامی سے منسوب کیا جاتا ہے یعنی "محمدؐ و دونہ تحت لوائی یوم القیامہ" (محمدؐ اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ، قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے) مرتب کہتے ہیں کہ حضرت شیخؒ نے اس کا یہ جواب دیا۔ فارسی عبارت کا ترجمہ:

"انہوں نے نہیں کہا ہے۔ یہ ان کی بات نہیں ہے۔ ایک وقت میں انہوں نے "سبحانی ما اعظم شانی" کہا تھا، اس کے بعد آخر عمر میں اس سے تائب ہوئے اور کہا "میں نے یہ اچھی نیک بات نہیں کہی، میں ایک یہودی تھا۔ اب اس وقت اپنا زنّار توڑتا ہوں، از سرِ نو مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں، اشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشہد ان محمدا عبدہ و رسولہ"۔

تبصرہ: "بہرحال مرتب ملفوظات نے حضرت بایزید بسطامی کی طرف منسوب جو بات سنی تھی اس کی تردید کر دی۔ اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ گمراہ لوگوں نے بزرگوں کی طرف بہت کچھ منسوب کر دیا ہے"۔

قفلِ سعادت کی کنجیاں

اس عنوان کے تحت حضرت نظام الدین اولیاء کا یہ قول نقل کیا گیا ہے "قفلِ سعادت کی بہت سی کنجیاں ہیں۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ کس کنجی سے قفل کھلے گا لہٰذا ہر کنجی کو گرفت میں لینا چاہیے (ہر طاعت کا التزام کرنا چاہیے خواہ وہ مالی ہو یا بدنی یا اخلاقی) اگر اس کنجی ... نہ کھلے گا تو دوسری کلید سے کھلے گا۔ اگر اس سے کشادہ نہ ہو گا تو دوسری سے ہو گا" اس کے بعد یہ تبصرہ:

"حضرت شیخؒ کا یہ ارشاد احادیث نبویؐ کے مطابق اور بہت موثر ہے"۔　　(جاری ہے)

بقیہ: حکمت مودودیؒ

اللہ میں ہر وقت میدان گرم ہی نہیں رہا کرتا ہے اور نہ ہی ہر شخص اگلی ہی صفوں میں لڑ سکتا ہے۔ ایک وقت کی میدان آرائی کے لیے بسا اوقات پچیس پچیس سال تک لگاتار خاموش تیاری کرنی پڑتی ہے اور اگلی صفوں میں اگر ہزاروں آدمی لڑتے ہیں تو ان کے پیچھے لاکھوں آدمی ان کی ضروریات کے ان چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو ظاہر بین نظر میں بہت حقیر ہوتے ہیں۔ (اقتباس از تقریر امیر جماعت اسلامی، سید مودودیؒ مارچ ۱۹۴۴ء روداد جماعت اسلامی حصہ دوم ص ۳۵-۴۳)

رسائل و مسائل

ثعلبہ بن حاطب انصاری کا واقعہ

سوال :

ایک عربی مصنف کی کتاب کا اردو ترجمہ ''معجزاتِ سرورِعالم'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ثعلبہ پر افسوس کے زیرعنوان ایک صحابی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ثعلبہ نے آنحضورؐ سے مال و دولت کی فراوانی کے لیے دعا کی تھی۔ آنحضورؐ نے اس پر افسوس فرمایا کہ حقیر شے کے لیے دعا کی درخواست کی گئی۔ مگر انہوں نے اصرار کیا اور کہا کہ میں ہر حقدار کو بطریقِ احسن حق ادا کروں گا۔ اس پر رسولِ کریمؐ نے دعا فرمائی کہ اللہ ثعلبہ کو مال عطا کرے۔ چنانچہ ثعلبہ کی بکریوں میں اتنا اضافہ ہوا کہ مدینہ ان کے لیے تنگ ہوگیا۔ وہ مدینہ سے باہر ایک وادی میں چلا گیا۔ پہلے وہ ظہر و عصر کی نماز مسجد نبوی میں آکر پڑھتا تھا۔ پھر فقط جمعہ کی نماز میں آتا تھا پھر وہ بھی چھوٹ گئی۔ آنحضورؐ نے اس پر فرمایا : اے ثعلبہ تم پر افسوس۔ زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم نازل ہوا تو آنحضورؐ نے دو صحابی زکوٰۃ کی تحصیل کے لیے ثعلبہ اور ایک دوسرے آدمی کے پاس بھیجے۔ دوسرے آدمی نے برضا و رغبت زکوٰۃ پیش کی مگر ثعلبہ نے کہا کہ یہ تو جزیہ معلوم ہوتا ہے اور زکوٰۃ نہ دی۔ اس پر سورۂ توبہ کی آیت ۷۵ تا ۷۷ نازل ہوئی۔ ثعلبہ کو اس کا علم ہوا تو وہ مدینہ میں زکوٰۃ لے کر حاضر ہوئے مگر آپؐ نے فرمایا کہ اللہ نے اسے قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے' اور وہ روتا ہوا واپس ہوا۔ بعد میں اس نے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ تینوں کو زکوٰۃ پیش کی مگر سب نے انکار کردیا اور وہ ذلت کے ساتھ ہلاک ہوا۔

جن کتابوں کے حوالے سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے معلوم ہوا کہ ان میں ثعلبہ کا ذکر بطور بدری صحابی کے ہے مگر یہ کیسے صحیح ہے؟ پھر حضرت ابوبکرؓ نے تو زکوٰۃ کے منکرین و مرتدین کے خلاف جہاد کیا اور ارتداد کی سزا دی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مسلمان مسلسل زکوٰۃ سے انکار

کرتا رہے اور اس پر ارتداد کی حد جاری نہ ہو۔ سورۂ توبہ کی جن آیات میں بظاہر منافقین کا ذکر ہے ان کا اطلاق ایک صحابی پر کیسے ہوتا ہے؟

جواب:

کتاب "معجزاتِ سرورِ عالم" میں ثعلبہ کا قصہ جس طرح درج ہے اور اس کے لیے جن ماخذ کے حوالے دیے گئے ہیں یہ ضروری نہیں کہ ان میں بیان کردہ تفصیلات من و عن صحیح ہوں۔ ان میں پہلا حوالہ تفسیر ابنِ کثیر سورۃ التوبہ آیت ۷۵ کا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ درج ذیل ہے:

> ان میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے ہم پر فضل و کرم فرمایا تو ہم صدقہ دیں گے اور صالحین بن کر رہیں گے مگر جب اللہ نے ان پر فضل فرمایا تو انہوں نے بخل سے کام لیا اور منہ موڑتے ہوئے اپنے وعدے سے پھر گئے۔ اس کا انجام ان کے حق میں یہ ہوا کہ قیامت کے روز اللہ کے سامنے حاضری تک ان کے دلوں میں نفاق کو راسخ کردیا کیونکہ انہوں نے اس وعدے کی مخالفت کی جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا اور وہ برابر جھوٹ بولتے رہے۔ (التوبہ ۷۵ - ۷۷)

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> منافقین میں کوئی شخص ایسا بھی تھا جس نے اللہ سے عہد و میثاق باندھا تھا کہ اگر اللہ اسے اپنے فضل سے غنی کرے گا تو وہ خیرات دے گا اور نیکو کار بنے گا مگر اس نے وعدہ وفا نہ کیا' تو نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے ایسوں کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا' قیامت تک کے لیے۔

پھر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ آیت ثعلبہ بن حاطب انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر پورا قصہ بیان کیا ہے کہ ثعلبہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ دعا فرمایئے اللہ مجھے مال و دولت عطا فرمائے حضورؐ نے فرمایا کہ تھوڑا مال جس کا شکر ادا ہو' زیادہ سے اچھا ہے جس کی تجھ میں طاقت نہ ہو۔ اس نے دوبارہ اصرار کیا تو پھر آنحضورؐ نے فرمایا کہ کیا تو اس پر خوش نہیں کہ اللہ کے نبی جیسی زندگی گزارے۔ ثعلبہ نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق رسول بنا کر بھیجا ہے اگر مجھے مال ملا تو میں ہر حق دار کا حق ادا کروں گا۔ تب حضور اکرمؐ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! ثعلبہ کو مالدار بنا دے۔ چنانچہ ثعلبہ کی بکریوں میں ایسا اضافہ ہوا کہ مدینہ اس کے لیے تنگ ہوگیا اور وہ مدینہ چھوڑ کر ایک وادی میں چلا گیا۔ پہلے وہ ظہر و عصر کی

نماز مسجدِ نبویؐ میں ادا کرتا تھا پھر صرف جمعہ پڑھنے کے لیے آتا تھا۔ پھر نماز جمعہ بھی چھوٹ گئی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے ثعلبہ تجھ پر افسوس' تجھ پر افسوس' تجھ پر افسوس۔

پھر جب زکوٰۃ کی فرضیت سورۃ توبہ (۱۰۳) میں نازل ہوئی تو آنحضورؐ نے دو صحابیوں کو بھیجا کہ ثعلبہ اور بنو سلیم کے فلاں آدمی سے زکوٰۃ وصول کرکے لاؤ اور اپنا حکم نامہ لکھوا کر ان کے حوالے کیا۔ بنو سلیم کے فرد نے زکوٰۃ پیش کردی مگر ثعلبہ نے بار بار ٹال مٹول سے کام لیا اور مکتوبِ نبویؐ دیکھ کر کہا کہ یہ تو جزیہ معلوم ہوتا ہے۔ تم لوگ چلے جاؤ اور مجھے سوچ بچار کرنے دو۔ ثعلبہ کی اس روش پر سورۃ توبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ نازل ہوئیں۔ ثعلبہ کے بعض رشتہ داروں نے جاکر اسے مطلع کیا اور وہ اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوا تو آنحضورؐ نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارا صدقہ لینے سے منع فرما دیا ہے۔ ثعلبہ اپنے سر پر مٹی ڈالتا ہوا واپس چلا گیا۔ پھر اس نے حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ کو اپنی زکوٰۃ دینا چاہی مگر تینوں نے انکار کردیا حتیٰ کہ وہ اسی حالت میں فوت ہوگیا۔

تفسیر ابن کثیر کے علاوہ یہ پورا قصہ اسد الغابہ اور الاصابہ میں بھی منقول ہے۔ اسد الغابہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ ابن مندہ' ابونعیم' ابن عبدالبر سب نے صراحت کی ہے کہ ثعلبہ ابن حاطب بدری صحابی ہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بدری صحابی اس زمرۂ منافقین میں کیسے شمار ہوسکتے ہیں جن سے ایسی دنیا داری' بخل اور زکوٰۃ وصلوٰۃ کے بارے میں ایسا اعراض و انکار پے در پے صادر ہوتا رہا ہو جیسا کہ اس قصے میں بیان ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بدری صحابی بھی معصوم عن الخطا نہیں اور ان میں سے بعض صحابہ سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں لیکن ان کا صدور احیاناً" ہوا ہے اور قرائن ایسے تھے جو خطا کی سنگینی و شدت پر دلالت نہیں کرتے تھے' اس لیے ان غلطیوں پر بلا مواخذہ یا بعد از مواخذہ معاف فرمایا گیا اور حضرت حاطبؓ ابن ابی بلتعہ کی عذر پذیری کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا:

تمہیں کیا خبر' ممکن ہے کہ اہلِ بدر سے اللہ نے فرمایا ہو کہ خواہ تم کچھ بھی کرو' میں نے تمہیں معاف کردیا۔

یہ حضرت حاطبؓ بھی بدری صحابی اور مہاجرین میں سے تھے۔ لیکن ثعلبہ کا قصہ یہ بتا رہا ہے کہ وہ منافقین میں شامل اور ایسی سیرت اور کردار کے حامل ہیں کہ قابلِ معافی نہیں' روزِ قیامت تک' نفاق ان کے دل میں بٹھا دیا گیا اور بدعہدی و کذب بیانی پر ان کا اصرار و استمرار

عرصہ دراز تک جاری رہا۔

اس کے بعد الاصابہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں پہلے ثعلبہ بن حاطب انصاری کا ذکر کیا ہے اور ان کے حالات میں صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ بدری تھے اور ابن الکلبی کہتے ہیں کہ وہ غزوۂ احد میں شہید ہوگئے۔ اس کے بعد ابن حجر نے اس نام کے ایک دوسرے ثعلبہ بن حاطب انصاری کا حال بیان کیا ہے اور ابن اسحاق کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسجد ضرار کے بانیوں میں یہ ثعلبہ بھی تھے اور ان کا وہی قصہ مختصراً بیان کیا ہے جو اسد الغابہ میں ہے۔ پھر ابن حجر فرماتے ہیں:

"لی کون صاحب ہذہ القصہ صح الخبر ولا اظن یصح ھو البدری المذکور قبلہ نظر"

(یہ قصہ اگر صحیح ہے اور میرا گمان یہ ہے کہ صحیح نہیں ہے، اس میں جس شخص کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ثعلبہ نہیں جن کا ذکر اس سے قبل بدری صحابی کے طور پر ہوا۔)

یہ بات محلِ نظر ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی فرد مذکور ہو کیونکہ اگر ثعلبہ بدری صحابی ہیں تو یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"لا یدخل النار احد یشھد بدرا" والحدیبیہ"

(بدر و حدیبیہ کی جنگ میں شریک ہونے والے صحابی دوزخ میں نہیں جائیں گے)۔

نیز آنحضورؐ نے فرمایا:

اے اہلِ بدر، جو چاہو کرو، میں نے تمہاری مغفرت فرمادی۔

پھر ابنِ حجر فرماتے ہیں:

"لمن یکون لھذہ المشابتہ کیف یعقبہ اللہ نفاقا فی قلبہ و ینزل فیہ ما نزل فالظاھر انہ غیرہ واللہ اعلم"

(جو صاحب اتنے بلند مرتبہ ہوں اللہ تعالیٰ آخر ان کے دل میں نفاق کیسے جاگزیں کردے گا اور ان آیات کا ان کے بارے میں نزول ہوگا جو سورۃ توبہ کے اس مقام پر نازل ہوئیں۔ پس یہ ظاہر ہے کہ بدری صحابی اور ہیں اور زکوٰۃ نہ دینے والے اور ہیں۔ واللہ اعلم۔)

پھر ثعلبہ بن حاطب کا مسجدِ ضرار کے بانیوں میں ہونا تفسیر ابن کثیر سورہ توبہ آیت ۱۰۷ کے تحت بھی بیان ہوا ہے۔ حافظ ابنِ کثیر لکھتے ہیں کہ بارہ آدمی مسجدِ ضرار بنانے والے تھے، پھر ان

کے نام درج کیے ہیں جن میں ثعلبہ بن حاطب کا نام بھی شامل ہے۔

بہرحال ثعلبہ بن حاطب کی شناخت (Identification) اور ان سے متعلق بیان کردہ حالات و تفصیلات میں بڑے اشکالات و التباسات ہیں' لہٰذا تفسیر و تاریخ میں ثعلبہ کے جو حالات و واقعات مذکور ہیں ان سے کسی طرح کا استنباط و استدلال میرے نزدیک درست نہیں۔

اس کے بعد جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف تلوار اٹھانے کا تعلق ہے تو یہ بحث اپنی جگہ پر بہت تشریح و تفصیل طلب ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ ایک آدھ یا چند گنتی کے افراد نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا تھا۔ یہ ارتداد و الحاد کا ایک ہمہ پہلو و ملک گیر طوفان تھا۔ جس میں نو مسلم اعراب و قبائل نے مختلف طریقوں سے الٹے پاؤں پھر کر انحراف و بغاوت کا علم بلند کرلیا تھا۔ بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا تھا۔ بعض مدعیان کاذبین نے نئی نبوت کا اعلان کردیا اور کچھ نمازیں معاف کردی تھیں۔ علامہ ابن جریر طبری نے لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ رحلتِ نبویؐ کے بعد ملتِ اسلامیہ کا حال ایک بکری کے مانند ہوگیا تھا جو تاریک رات میں جنگل و بیابان میں تنہا ہو اور چاروں طرف درندے دھاڑتے پھرتے ہوں۔ یہ حضرت ابوبکرؓ تھے جو پامردی اور عزیمت و استقامت کے ساتھ اس فتنے کے سامنے سینہ سپر ہوگئے اور جنہوں نے مرتدین کے چھکے چھڑا دیئے۔ بعض ان میں سے نادم و تائب ہوکر دائرہ اسلام میں واپس آگئے اور بعض تلوار کی بھینٹ چڑھ کر واصلِ جہنم ہوئے۔ آج بھی اگر کوئی مسلمان فرائضِ اسلام میں سے کسی فریضے کا اعلانیہ انکار کرتا ہے تو اسلامی حکومت کی عدالتِ مجاز میں اس کے خلاف جرمِ ارتداد کا فوجداری مقدمہ دائر ہوگا۔ اگر وہ جرم کا اقبال و اقرار کرے گا یا اس کے خلاف ارتکابِ جرم کا غیر مشتبہ ثبوت فراہم ہوجائے گا اور وہ جرم پر اصرار کرے گا تو اس کی آخری سزا موت ہوسکتی ہے اور اگر وہ اپنے جرم پر تائب و نادم ہوجائے تو اس کی سزا ملتوی و منسوخ ہوسکتی ہے۔ لیکن فقہائے حنفیہ کے مسلک کے مطابق ارتداد کی معافی صرف دو مرتبہ معتبر ہے۔ اگر کوئی شخص جرمِ ارتداد کا ارتکاب دو سے زائد تیسری مرتبہ کرے گا تو وہ قابل معافی نہ ہوگا۔

مطبوعات

پاکستان میں مسیحیت (دو حصے) : مولف: ڈاکٹر نادر رضا صدیقی' نظرثانی: حافظ نذر احمد' ناشر: مسلم اکادمی ۱۸/۲۹ محمد نگر' علامہ اقبال روڈ' لاہور' کوڈ ۵۴۰۰۰۔ صفحات حصہ اوّل : ۲۹۲ ' حصہ دوم : ۳۰۴ ' قیمت حصہ اوّل ۱۲۰ روپے' حصہ دوم ۱۲۰ روپے۔

پہلے حصے کا موضوع ہے : پاکستان میں مسیحیت --- جائزہ --- ۔ دوسرے حصے کا موضوع : پاکستان میں مسیحیت۔

مسیحیت کا موضوع پورے عالمِ اسلام میں اہمیت اختیار کرچکا ہے۔ انڈونیشیا کی اسلامیت کچلی جاچکی' مصر' سوڈان' الجیریا' الجزائر' لبنان وغیرہ سب زخم خوردہ ہیں اور ان علاقوں کے اکثریتی مسلمان' عیسائی اقلیت سے خوفزدہ ہیں جو ایک ہاتھ سے بائیبل دیتی ہے' دوسرے ہاتھ سے بچوں کو چاکلیٹ اور بڑوں کو روٹی' مریضوں کو دوا' طلبہ کے لیے وظائف' نوجوانوں کے شادی کے انتظامات' غریبوں کے لیے خیراتی فنڈز کا استعمال ---- اور اس محاذ کے پیچھے مغربی عیسائی تنظیمیں بلکہ حکومتیں تک ہیں۔ وہاں سے فنڈز آتے ہیں' مبلغ آتے ہیں' اہلِ خدمت آتے ہیں' اور تعدادیں بڑھائی جارہی ہیں' کہیں کہیں ہتھیار بھی موجود ہیں' عالمی پریس ان کے حق میں پروپیگنڈہ بھی کرتا ہے۔ جے سالک کے معاملے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عجب مداری کی سی شخصیت ہے اور مغرب میں اس کے لیے تہلکہ مچا ہوا ہے۔ اور پاکستان کو تشدد اور جبر کرنے کا ملزم گردانا جارہا ہے۔

کاغذوں پر لکھی ہوئی باتیں اور تقریریں اور نعرے کیسے ہی خوشنما ہوں اور آپ کتنا ہی عیسائیوں کو بھائی اور جانی دوست بنائیں' ان کی ذہنیت وہی رہے گی جسے بوسنیا کی مظلومیت نے بے نقاب کردیا ہے۔ عیسائیوں کا فنڈا منٹل ازم (انہی کا ایجاد کردہ) کیسا خونخوار ہے۔ مشنری رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد پاکستان میں بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ

اب سیاسی ہنگامہ آرائی کی طرف بھی مائل ہو رہے ہیں۔

ایسے حالات کے ہوتے ہوئے یہ کتاب بہت چونکا دینے والی ہے۔ اس میں مسیحی آبادی کے اضافے کی رفتار دیکھ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ تفصیلات تو کتاب میں دیکھیں' صرف رفتارِ اضافہ کا اندازہ یہاں درج ہے :

۸۱ - ۱۹۵۱ میں اضافہ :

مجموعی آبادی میں اضافہ = تقریباً ۱۵۰ فیصدی

مسلم آبادی میں اضافہ = تقریباً ۱۴۹ فیصدی

مسیحی آبادی میں اضافہ = تقریباً ۲۰۲ فیصدی

(بحوالہ رپورٹ مردم شماری پاکستان ۱۹۵۱'۱۹۶۱'۱۹۷۲'۱۹۸۱)

پاکستان میں اس وقت مسیحی ۱۳ لاکھ ۱۰ ہزار ۴۲۶ ہیں۔

یہ لوگ دوسری اقلیتوں' خصوصاً قادیانیوں' اسمٰعیلیوں' بہائیوں کے ساتھ مل کر اٹھتے ہیں بلکہ جب وہ پی ڈی اے یا پی پی کا طوفان اٹھتے دیکھتے ہیں تو ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

خاص طور پر ان کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کو جڑ نہ پکڑنے دی جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ بڑھائے جانے کے خلاف ہیں۔ اصل مخالفت تو قادیانیوں کی ہوگی' لیکن دوسری اقلیتیں اس لیے اس معاملے میں یکسو ہیں کہ وہ اپنی حقیقت کو مخفی رکھ کر بعض ایسے حقوق یا عہدے حاصل کرلیں جو ان کا استحقاق نہیں بنتے۔

افسوس کہ میں نے کتاب پر لکھنے سے زیادہ مسیحیت کی مصیبت کا قصہ لکھا ہے۔ بہرحال اس کتاب میں (حصہ اوّل) مسیحیت کی حقیقت' اناجیل کا قصہ' مختلف فرقے اور کلیسا اور عیسائیوں' مذہبی پیشواؤں اور مشنوں میں اخلاقی خرابیاں' ان کے جھگڑے' ان کے عقیدوں کا تجزیہ' بہت سے معلوماتی ضمیمے اور علی میاں کی تقریظ اور حافظ نذر احمد کا پیش لفظ ---- شامل ہیں۔

دوسرے حصے میں بھی تقریظ اور پیش لفظ کے بعد مسیحی مشنریوں اور ان کے تبلیغی طریقے اور ذرائع و وسائل کا استعمال' مختلف ممالک میں ان کے کارنامے' پاکستان میں نفوذ کی تفصیلی رپورٹ ان کی کامیاب صیادی کے اسباب' ان کے تعلیمی ادارے' یتیم خانے' عورتوں کا مشنری کام' مسیحی جرائد' ناشرین' بائبل کا کارسپانڈنس اسکول وغیرہ موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے' اس کا عشر عشیر بھی نقل نہیں ہو سکتا۔

کتاب ایسی اہم ہے کہ اب اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ لازماً پڑھیں اور مسئلے پر غور

کریں۔

(ن - ص)

نصف صدی قبل کا سفرنامۂ حج : صاحبِ ترتیبِ نو (حالات زندگی و حواشی کے ساتھ): مولانا محمد برہان الدین سنبھلی علیہ الرحمتہ ۔ اصل سفرنامہ : الحاج مولانا قاری حکیم محمد حمیدالدین سنبھلی علیہ الرحمتہ۔ ناشر: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۔ ۱۱۲ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب قاری حکیم محمد حمید الدین سنبھلیؒ کے سفرنامۂ حج و زیارات حرمین پر مشتمل ہے۔

قاری صاحب کی پیدائش بہ مقام ڈیگ (ریاست بھرت پور) مورخہ ۴ جولائی ۱۸۹۳ کو ہوئی۔ حفظِ قرآن' عربی و فارسی پڑھنے کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۸ میں سندِ فراغت حاصل کی۔ علمِ تجوید و قرات اور فنِ طب کا تکمیلی مطالعہ مراد آباد میں کیا۔ زیارتِ حرمین کے بعد علوم کی اشاعت کا کام کیا اور ۱۹۲۹ میں مدرسہ حمیدیہ تجوید القرآن قائم کیا۔ پھر لڑکیوں کے لیے بھی مدرسہ قائم کیا۔ ۱۵ مئی ۱۹۵۸ کو وفات پائی۔ اپنی تحریر میں اساتذہ و تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ۲۱ شعبان ۱۳۵۳ھ کو مکہ مکرمہ میں پہنچے۔ پھر مدینہ شریف گئے' پھر مکہ آئے۔ اس دور میں وہاں کے جو احوالِ غربی لکھے ہیں وہ پڑھ کر آج بھی قلق محسوس ہوتا ہے۔ شرفائے مدینہ کا یہ حال کہ کھانے پینے کو کچھ نہیں مگر سوال کسی سے نہیں کریں گے۔ ایسی لڑکیاں دیکھیں کہ اندر لباس محض دھجیوں پر مشتمل' لیکن اس پر برقع پورا سا تر۔ ترکی دور میں یہ عالم تھا کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ لگ جاتا۔ مگر وہ دور گیا اور ترک سامراجیوں کی پیدا کردہ تفریق عرب و ترک کی وجہ سے سخت بدحال ہوگئے۔ چند دلچسپ تفصیلی نوٹس وہاں کے احوال کے لکھے تھے' مگر انھیں چھوڑ کر میں ایک مرتب سفرنامہ کے تعارفی مضمون سے لکھنا کافی سمجھتا ہوں:

اس کے مطالعہ سے قاری کو یہ اندازہ ضرور ہوجاتا ہے کہ یہ ایک ایسے حساس بلکہ گداز قلب' بیدار مغز ---- چشمِ بینا اور گوشِ شنوا رکھنے والے کے قلم سے ہے جس نے صرف روئیدادِ سفر ہی سنانے' اور کیمرہ کی مانند بس منظر کشی کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ سبق آموز واقعات سے' مشورہ طلب مواقع پر مفید مشورہ دینے' اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی سعادت پر آنسوؤں کے نذرانے پیش کرنے میں بھی کمی نہیں کی ہے۔ نیز ادب و انشاء پردازی میں شہرت نہ رکھنے کے باوجود "سادگی اور پُرکاری" کا ایک اچھا

اور پُر تاثر نمونہ۔

نیز ۵۰ سال پہلے کے ذرائع و وسائل خاص طور پر سامنے آتے ہیں اور آج سے تقابل کرکے فرق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ضمناً یہ کہ حج کے مسائل بھی بیان کیے ہیں۔ صاحبِ سفرنامہ کے فرزند اصغر جناب قمر سنبھلی کی ایک نظم (مسافرانِ حرم سے) اور ایک نعت بھی شاملِ کتاب ہے۔ نعت کا ایک شعر۔

لحن بلالؓ کا' حسانؓ کی زباں مل جائے[۱]
مرے نصیب کے ہو جائیں آئینے روشن

(ن۔ص)

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے فکری کام کا ایک جائزہ: از سیّد معروف شاہ شیرازی۔
صفحات ۴۰۔ قیمت ۹ روپے۔ ناشر: عارف شیرازی' ادارہ منشوراتِ اسلامی' منصورہ لاہور۔

یہ کوئی بڑی کتاب تو نہیں' مگر اپنے اختیار کردہ اہم موضوع پر بہت مفید سامان غور و مطالعہ مصنف نے جمع کردیا ہے۔ عالم اسلامی کے معاصرانہ ماحول اور سیاست برصغیر کی جھلک دکھاتے ہوئے مولینا مودودیؒ کے فکری کام کا جائزہ لیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولینا مودودیؒ کو کس چیز نے ایک سیاسی جماعت کا سربراہ بن کر رہ جانے کے بجائے' تحریک تجدید و احیائے دین کا قائد بنایا اور موصوف کے فکری خطوط پر کام کرنے کے لیے جماعتِ اسلامی وجود میں آئی۔

(ن۔ص)

مدارسِ عربیہ اور اسلامی انقلاب: از سیّد معروف شاہ شیرازی۔ صفحات ۶۶' قیمت ۱۵ روپے۔ ناشر: سیّد عارف شیرازی' ادارۂ منشورات اسلامی بالمقابل منصورہ' ملتان روڈ لاہور۔

اس مقالے کا تعلق نہایت اہم موضوع سے ہے' یعنی پرانے نقشے پر کام کرنے والے مدارسِ عربیہ میں وہ کیا تبدیلیاں لائی جائیں کہ درسِ نظامی جدید ضروریات کو پورا کرسکے۔ مصنف نے رہنمائی مولینا مودودیؒ کی تعلیمی فکر سے لی ہے۔ اس راستے پر جو بھی کوشش کی جائے' اس پر غور کرنا چاہیے۔ راقم کا اپنا نظریہ مولینا مودودیؒ ہی کی فکر کی روشنی میں دو قدم اور آگے جاتا ہے۔ مگر بحث کا موقع نہیں۔

(ن۔ص)

۱۔ لحن کا لفظ تو حسانؓ کے ساتھ آنا چاہیے' حضرت بلالؓ کے نام کے ساتھ یا تو "اذاں" آنا چاہیے یا "ندا" آنا چاہیے۔ (مشورہ)

REGD. NO. L 5340

PHONE : 234014
236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مختصر حواشی

*** سید ابو الاعلیٰ مودودی

اس میں مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور
تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی
درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ
مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں

تفہیم القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ● صفحات: ۱۵۸۴ ● ہدیہ: -/۱۷۵ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

فون: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ ● پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳